مولانا عبدالباری ندویؒ

شخصیت اور دینی و علمی خدمات

مرتب
محمد وثیق ندوی

مولانا عبدالباری ندوی ایجوکیشنل سوسائٹی، لکھنؤ

مولانا عبدالباری ندویؒ

شخصیت اور دینی و علمی خدمات

مرتب

محمد وثیق ندوی

ناشر

مولانا عبدالباری ندوی ایجوکیشنل سوسائٹی، لکھنؤ

۱۴۳۸ھ - ۲۰۱۶ء

نام کتاب : مولانا عبدالباری ندوی
شخصیت اور دینی و علمی خدمات

مرتب : محمد وثیق ندوی
صفحات : ۱۹۲
تعداد : ۵۰۰
قیمت : Rs.140/-

ملنے کے پتے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، فون 0522-2741539
مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، امین آباد، لکھنؤ، فون 9415912042
مکتبہ ندویہ، احاطہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ، فون 9335070285
مکتبہ احسان، مکارم نگر، لکھنؤ، فون 9793118234
مکتبۃ الشباب العلمیۃ، شباب مارکیٹ، مکارم نگر، لکھنؤ 9696437283
الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ 6535664. (0522)2610443

ناشر

مولانا عبدالباری ندوی ایجوکیشنل سوسائٹی، لکھنؤ

فہرست

مقدمہ	۷
عرض مرتب	۱۱
باب اول حالات زندگی	
مولانا عبدالباری ندویؒ: شخصیت اور دینی وعلمی خدمات	۱۴
ولادت ووطن	۱۷
خاندان	۱۷
ابتدائی تعلیم وتربیت	۱۷
دارالعلوم ندوۃ العلماء کی علمی فضاء میں اور علامہ شبلیؒ سے ربطِ خاص	۱۸
جدید علوم کی تحصیل	۱۸
مشاہیر اساتذۂ کرام	۱۹
دکن کالج پونا میں اور گجرات کالج تبادلہ	۱۹
گجرات کالج سے وابستگی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس	۲۰
قیام حیدرآباد اور کامیاب ترین تراجم	۲۰
مولانا عبدالباری ندویؒ اور تحریکِ ندوۃ العلماء	۲۱
دارالمصنفین سے علمی وانتظامی ربط	۲۲
سفر حج	۲۲
تصوف وسلوک	۲۳
محبین ومستفیدین	۲۴

وفات	۲۵
نمایاں اوصاف وکمالات اور امتیازی خصوصیات	۲۵
تواضع وللہیت	۲۶
دینی وایمانی غیرت وحمیت اور مسلکِ صحیح کی حفاظت کا اہتمام	۲۷
دینی ودنیوی جامعیت	۲۷
اعلیٰ ادبی ذوق	۲۷
اسلوبِ تحریر	۲۸
علمی خدمات - ایک جائزہ	۲۸
تصنیفات - تعارف وتبصرہ	۲۸
تراجم اور مبادئ علومِ انسانی	۲۹
تراجم کا امتیاز اور علامہ سید سلیمان ندوی کا اعتراف	۳۰
فلسفیانہ محاکمات ومقدمات	۳۰
فلسفیانہ تصانیف	۳۰
مذہب اور سائنس	۳۱
مذہب وعقلیات	۳۱
کلامیات سائنس	۳۲
فلسفیانہ تصانیف کا اسلوب	۳۲
صوفیانہ تصانیف	۳۲
جامع المجدد دین (تجدید دین کامل)	۳۳
تجدیدِ تصوف وسلوک	۳۳
تجدید تعلیم وتبلیغ	۳۴
تجدید معاشیات	۳۴

تجدیدِ کلامیات	۳۵
صوفیانہ تصانیف کا امتیاز	۳۵
صوفیانہ تصانیف کا اسلوب	۳۵
قرآنی خدمات	۳۵
قرآن کا دو آیاتی نظامِ صلاح و اصلاح	۳۶
کلامیاتِ قرآن	۳۶
مولانا عبدالباری ندویؒ بحیثیت فلسفی	۳۶
دینی خدمات	۳۸
نسلِ نو کی اسلامی ذہن سازی اولین ترجیحی مسئلہ - تدبیر و تجویز	۳۹
کوئی نظریۂ دعوت اپنے عملی ظہور کے بغیر مؤثر نہیں ہوسکتا	۳۹
صلاح و اصلاح کی ذمہ داری امتِ محمدیہ پر	۳۹
سارے افراد میں دینی خیر طلبی کے عملی ظہور کی ضرورت	۴۰

باب دوم

شخصیت و انفرادیت

مولانا عبدالباری ندویؒ اور مذہب و عقلیات کے ٹکراؤ کا تصور (مولانا) سید محمد واضح رشید حسنی ندوی	۴۴
علامہ عبدالباری ندویؒ مایہ ناز شخصیت اور عظیم فلسفی	۵۳
مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	
مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ کے باہمی مراسم	۶۱
پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی	
فلسفۂ جدید کا نکتہ داں عبقری شخصیت مولانا عبدالباری ندویؒ / مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی	۶۵

مولانا عبدالباری ندوی کا مذاق تصوف 'تجدید تصوف وسلوک'' کے آئینہ میں	۷۲
مولانا محمد علاء الدین ندوی	
مولانا عبدالباری ندویؒ اور اسلامی اقامت خانوں کی دعوت اور اس کے اثرات	۸۷
محمود حسن حسنی ندوی	
حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ ایک عارف اور ولی	۹۲
محمد مسعود عزیزی ندوی	
مولانا عبدالباری ندویؒ کے خطوط بنام مولانا محمد عمران خان ندوی ازہریؒ - ایک مطالعہ	۹۵
ڈاکٹر سفیان حسان ندوی	
باب سوم تصنیفات وافکار	
مولانا عبدالباری ندوی اور ان کا سلسلۂ تجدید	۱۰۲
مولانا محمد برہان الدین سنبھلی	
مولانا عبدالباری ندویؒ کی تصنیف ''تجدید معاشیات'' - ایک تعارفی مطالعہ	۱۰۷
پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	
مذہب اور سائنس / پروفیسر محمد محسن عثمانی ندوی	۱۲۳
غزالیٔ وقت - مولانا عبدالباری ندویؒ / مولانا سید سلمان حسینی ندوی	۱۲۸
تفسیر سورۃ العصر المسمی بہ نظام صلاح واصلاح - تنقیدی جائزہ / پروفیسر ابوسفیان اصلاحی	۱۶۲
مولانا عبدالباریؒ کا سلسلہ تجدید اور اس کی خصوصیات / مفتی مولانا محمد زید ندوی مظاہری	۱۷۷
مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب مذہب وسائنس - ایک مطالعہ - فیصل احمد ندوی بھٹکلی	۱۸۲
سیمینار کی رپورٹ / محمد وثیق ندوی / محمد سلمان نسیم ندوی	۱۸۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد بن عبد الله الأمين، وعلى آله وصحبه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين، أما بعد!۔

مولانا عبدالباری ندویؒ اس عہد کی نمایاں شخصیت تھے جس میں برطانوی سامراج کے ظالمانہ طریقوں سے ہندوستان کی امت مسلمہ اپنی پستی اور بے بسی کے احساس کی بنیاد پر اپنی بے بسی کے تدارک کی خاطر فکرمند تھی، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور طبقۂ علماء کے متعدد فکرمند حضرات اپنی اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے توجہ کررہے تھے، اس میں علماء کے طبقہ سے ندوۃ العلماء کی تحریک اصلاح نصاب تعلیم کے داعی حضرات میں علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت نمائندہ شخصیت تھی جن کی فکرمندی زیادہ نمایاں تھی، انہوں نے اپنی فکرمندی کے نتیجہ میں اپنے سے تعلق کے کئی اصحابِ فکر رفقاء اور نئی نسل کے کئی افراد حاصل کرلیے تھے، ان میں طبقۂ علماء سے مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ اور جدید طبقہ سے مولانا عبدالماجد دریابادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہوں نے علمی میدان میں شہرت کے ساتھ دینی مقام بھی حاصل کرلیا تھا اور وہ علامہ کے خاص شاگردوں کی حیثیت سے معروف ہوئے۔

مولانا عبدالباری ندویؒ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے پر جدید علوم کو دین وملت کی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کی اچھی کوشش کی، وہ حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی میں اس حیثیت سے متعارف ہوئے اور اس میدان میں ان کی کئی قابل قدر کارگزاریاں سامنے آئیں، جو بعد میں کتابی صورت میں اہل علم کے لیے ممد ومعاون ہوئیں، حیدرآباد

میں مولانا جب فلسفہ کے استاد کی حیثیت سے تجویز ہوئے، تو نظام حیدرآباد نے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ عالم دین ہیں، جدید علوم سے کہاں واقفیت ہوگی، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی جن کی کوشش سے مولانا کا تقرر ہوا تھا، انہوں نے نواب صاحب کو بتایا کہ یہ فلسفہ کے ایسے ماہر ہیں کہ انہوں نے فلسفہ کو مسلمان بنا دیا ہے اور یہ بات ان کی صحیح ثابت ہوئی، فلسفہ اور مذہب کے تعلق سے انہوں نے جو تصنیفی کام کیا ہے، اس سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

علمی صلاحیت اور تصنیفی خدمات کے ساتھ ساتھ مولانا میں دینی اصلاح اور تزکیۂ نفس کا جذبہ بھی نمایاں ہوا اور اپنے عہد کے مشائخ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور پھر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے استفادہ کیا اور دینی اصلاح و ارشاد میں ان کا اعتماد حاصل کیا، اس کی بنا پر اصلاح عوام کی طرف ان کو بڑی توجہ ہوئی، ان اہل علم کو جو دینی علوم سے بھی وابستہ تھے، اس اہم ضرورت کی طرف متوجہ کیا اور خاص طور پر جو ان سے قریب اور متعلق تھے، ان کی طرف توجہ کی اور ان کی ان کوششوں سے بہت فائدہ ہوا۔

مولانا عبدالباری ندویؒ کو عام لوگوں کی اصلاح اور سنتوں پر عمل کرانے کا بڑا جذبہ تھا اور اس سلسلہ میں سخت تھے، چنانچہ انہوں نے اس میں اپنے صاحبزدگان سے بھی سختی کی اور ان کی تعلیم کے دوران ان کو اچھا بنانے کی سختی کے ساتھ کوشش کی، وہ بزرگوں سے جب ملتے تھے تو ان سے بھی اپنے اس احساس کا اظہار کرتے تھے کہ لوگوں میں بہت خطرناک برائیاں ہیں، ان کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے اور کس طرح کی محنت کی جائے، اور یہ جذبہ ان میں بعض وقت بہت بڑھ جاتا تھا، اسی جذبہ کے ماتحت ایک مرتبہ وہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بات کر رہے تھے اور اپنے تاثر کا اظہار کر رہے تھے، اس پر حضرت مولانا نے فرمایا: آپ کیا چاہتے ہیں کہ شیطان مر جائے، جس کو اللہ تعالیٰ نے بہکانے کے لیے چھوڑ دیا ہے، وہ تو اپنا کام کرے گا، برائیوں کا سلسلہ کچھ نہ کچھ تو رہے گا، ہم سب کو اپنی حد تک کوشش کرنا ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے انہوں نے استرشاد و اصلاح باطنی کا جو

استفادہ کیا اس کو بھی انہوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ تصوف کے طریقہ کار کو اچھے اسلوب میں متعارف کرایا۔

ریٹائرڈ ہونے کے بعد مولانا لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قریب مقیم ہوئے اور ان کا دارالعلوم سے برابر ربط رہا، وہ یہاں بھی توجہ دلاتے تھے کہ دینی سیرت واخلاق کی طرف خاص توجہ کی جائے، اور معلوم بھی کرتے تھے اور مشورہ بھی دیتے تھے، اور وہ دیندار شخصیتوں سے خصوصی محبت وتعلق رکھتے تھے، ندوۃ العلماء کے ناظم ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ سے ان کو خصوصی ربط تھا؛ بلکہ وہ ان سے ملنے کے لیے ہر جمعہ کی نماز انہی کے مکان کے قریب کی مسجد میں پڑھتے تھے، پھر ان کی رفیقانہ انداز کی ملاقات ہوتی تھی، ان کے مکان اور ڈاکٹر صاحب کے مکان کے درمیان بڑا فاصلہ تھا؛ لیکن وہ فاصلہ طے کرکے آتے تھے، نماز کے بعد دونوں بزرگ دیر تک بیٹھتے اور آپس میں تبادلۂ خیال اور گفتگو کرتے تھے، اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب جب بھی لکھنؤ آتے تھے ان کا قیام ڈاکٹر صاحب ہی کے مکان میں ہوتا تھا، ان کے قیام کے موقع پر مولانا عبدالباری صاحب ضرور آکر شریک صحبت ہوتے، اسی طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دیگر رفقاء سے بھی برابر ربط رکھتے تھے، خود کو بھی اجازت حاصل تھی، حضرت تھانویؒ کے خلفاء جو قریب کے شہروں میں تھے ان سے مولانا کا برابر ربط تھا، جن میں مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی اور مولانا ابرار الحق حقی جو ہردوئی میں مقیم تھے ان سے دوستانہ اور برادرانہ تعلق برابر قائم رہتا تھا۔

مولانا اپنی عام زندگی میں نفاست پسند تھے، بہت صاف ستھرا لباس اور سلیقہ مندی کا انداز دیکھنے میں آتا تھا، اور ان سے مل کر آدمی کو ایک ربط اور انس معلوم ہوتا تھا، مولانا کے ان اوصاف اور اخلاق کا ان کے صاحبزادوں پر بھی اثر ہوا، اور وہ اپنے والد کے اس مقام کو سمجھتے ہوئے ان کے طریقہ کار کو اپنانے اور عام کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں، ان میں خاص طور پر احمد الباری صاحب اپنے والد کے بڑے معاون رہے تھے، اس معاونت کے نتیجہ میں ان میں مولانا کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، ان کے دوسرے صاحبزادہ فضل الباری

صاحب اور عبید الباری صاحب بھی اچھی سیرت واخلاق کے اصحاب ہیں۔

مولانا عبدالباری ندویؒ کی شخصیت اصلاح وارشاد کے سلسلہ میں رہنما شخصیت بن کر سامنے آئی، لیکن اس وقت ملک کے جو حالات تھے اس میں وہ زیادہ معروف نہیں ہوسکے تھے، حالانکہ ان کا طریقہ اصلاح بہت مفید تھا۔

لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کو سامنے لایا جائے، اسی مقصد سے مولانا کی شخصیت اوران کی علمی ودینی خدمات کے موضوع پر ندوۃ العلماء نے مولانا عبدالباری ندوی ایجوکیشنل سوسائٹی (لکھنؤ) کے اشتراک سے ایک روزہ سیمینار منعقد کیا، جس کے لیے اہم مقالات تیار کیے گئے، جن سے ان کی زندگی کے مختلف پہلوں پر روشنی پڑے گی، اوران کی دینی اور دعوتی خدمات سامنے آئیں گی، ان کے صاحبزدگان جناب فضل الباری صاحب اور جناب احمد الباری صاحب کے ہم مشکور ہیں کہ اپنے والد کی خدمات کو سامنے لانے کی کوشش کی، پیش نظر کتاب سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات پر مشتمل ہے، جس کو عزیزی مولوی محمد وثیق ندوی نے اچھے انداز میں مرتب کیا ہے، امید ہے کہ اس سے مذکورہ مقصد کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنو

۲۱/ذی قعدہ/۱۴۳۷ھ
۲۴/۰۸/۲۰۱۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مرتب

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبيين محمد بن عبد الله الأمين، وعلى آله وصحبه أجمعين وبعد۔

مولانا عبدالباری ندویؒ کا شمار ہندوستان کی ان شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے دعوت واصلاح، تعلیم وتربیت، تزکیہ وسلوک اور فکر اسلامی کے میدان میں انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں، مولانا نے علم کے راستہ سے اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا مدلل جواب دیا، عصری عقلیت وذہنیت کو جو یونانی فلسفہ سے متاثر تھی، مطمئن کیا اور اسلام کی حقانیت وصداقت کو ثابت کیا اور جدید طبقہ میں اسلام پر اعتماد کو بحال کیا، دوسری طرف فلسفہ کو مسلمان بنایا، تیسری طرف مسلم سماج کی اصلاح وتشکیلِ جدید میں اہم کردار ادا کیا اور ایک مسلمان کی زندگی کیسی ہونی چاہیے، اس کا لائحہ عمل پیش کیا جس کا نقشہ ان کی تصنیفات میں صاف نظر آتا ہے، مولانا کی زندگی میں جو تنوع اور جامعیت نظر آتی ہے اس کا سبب ان کی تربیت کے تشکیلی عناصر ہیں، مولانا نے قدیم وجدید دونوں مکتبہ ہائے فکر سے استفادہ کیا اور سلوک واحسان کی شناوری بھی کی، اس طرح مولانا کی شخصیت بڑی متوازن اور اسلامی رنگ وآہنگ میں رنگی ہوئی تھی۔

عرصہ سے ضرورت تھی کہ اس جامع اور متوازن شخصیت کو نئی نسل کے سامنے پیش کیا جائے، جو جدید افکار ونظریات اور مغربی تمدن کی وجہ سے شک وشبہ میں مبتلا ہے، اس مقصد کے لیے مولانا کے صاحبزدگان خصوصا فرزند اکبر مکرم جناب فضل الباری صاحب نے مکرم ومحترم جناب مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی صاحب (ناظر عام ندوۃ العلماء) کی تحریک ومشورہ سے ایک روزہ

سیمینار کا انتظام کیا، اس کے کنوینر استاد گرامی جناب مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری صاحب (صدر شعبۂ عربی دار العلوم ندوۃ العلماء) مقرر ہوئے، مولانا کے اشراف میں یہ سیمینار ۲۲؍نومبر ۲۰۱۵ء کو بروز اتوار بمقام عباسیہ ہال دار العلوم ندوۃ العلماء منعقد ہوا، جس میں ملک کی اہم شخصیات شریک ہوئیں اور مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر قیمتی مقالات پیش کیے گئے، جن سے مولانا کی شخصیت وانفرادیت اور تصنیفات وافکار کے اہم نکات سامنے آتے ہیں، اسی اہمیت کے پیش نظر ان مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے، اور یہ سعادت راقم کو حاصل ہوئی۔

پیش نظر مجموعہ تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں مولانا کی مختصر سوانح حیات کو پیش کیا گیا ہے، دوسر باب میں وہ مقالات رکھے گئے ہیں جن سے مولانا کی شخصیت وانفرادیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور تیسرے باب میں مولانا کی چند اہم تصنیفات وافکار کے جائزہ پر مشتمل مقالات پیش کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب میں محبّ گرامی جناب مولانا محمود حسن حسنی ندوی (نائب ایڈیٹر ''تعمیر حیات'') کا مشورہ اور تعاون حاصل رہا ہے، موصوف سیرت وسوانح کا اچھا ذوق اور سلیقہ رکھتے ہیں، اور اس موضوع پر ان کی کئی تصنیفات منظر عام پر آکر مقبول ہوچکی ہیں، خصوصا مولانا عبد الباری ندوی کی سیرت وسوانح پر ایک دستاویزی کتاب تصنیف کی جو مقبول خاص وعام ہوئی، اور اس سلسلہ میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، ہم ان کے تعاون کے شکر گزار ہیں۔

اسی طرح عزیزی شاداب ابراہیم بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کی پروف ریڈنگ میں تعاون دیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس مجموعہ سے استفادہ کو آسان بنائے اور مولانا کے صاحبزدگان خصوصا جناب فضل الباری صاحب کی کوششوں کو قبول فرمائے اور والد محترم کے دیگر تصنیفی ودعوتی کاموں کو منظر عام پر لانے کی مزید توفیق سے نوازے، واللہ ولی التوفیق۔

محمد وثیق ندوی

۲۸؍ذی قعدہ ۱۴۳۷ھ؍یکم ستمبر ۲۰۱۶ء

باب اول

حالات زندگی

مولانا عبدالباری ندویؒ

شخصیت اور دینی و علمی خدمات

چودھویں صدی ہجری کے آغاز اور انیسوی صدی عیسوی کے اختتام پر ملتِ اسلامیہ کی ایک عجیب تاریخ رقم ہو رہی تھی، اس وقت پورا عالمِ اسلام انتشار و پراگندگی، پریشان خیالی اور فکری اضمحلال کا شکار تھا، ہر جگہ جمود و تعطل کے آثار نمایاں تھے، جبکہ دوسری طرف مغرب زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی راہ پر گامزن تھا، لیکن اس کے باوجود مشرق حال سے بے خبر، مستقبل سے بے پرواہ، اور عظمتِ گزشتہ کی داستان سرائی میں مشغول تھا۔

اس عالمی منظر نامہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی حالت خاص طور پر بڑی قابل رحم تھی، یہاں وہ داخلی اور خارجی دونوں محاذوں پر پسپائی کے شکار تھے، داخلی طور پر جن حالات سے دوچار تھے اسکی بڑی وجہ یہ تھی کہ جب انگریز ہندوستان آئے تو اس وقت یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی، اس لئے مسلم حکمرانوں کی باہمی چپقلش اور عاقبت نا اندیشی کے نتیجہ میں مغلیہ سلطنت کا چراغ تو گل ہوگیا اور سات سمندر پار سے آئے گورے انگریز ہندوستانیوں کی قسمت کے مالک بن بیٹھے، لیکن مسلمانوں کے ذہنوں میں سلطنت کے زوال کا درد اور غلامی کا احساس باقی رہا جس کے نتیجہ میں مسلمان انگریزوں کے بڑھتے قدم کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتے، شاہ عبدالعزیزؒ کا انقلاب انگریز کا فتویٰ، تحریکِ شہیدین، ۱۸۵۷ء کی تحریکِ حریت اور جمعیۃ علماء ہند، آزادئ وطن کی طلائی زنجیر کی یادگار کڑیاں اور لافانی مثال ہیں۔

لہٰذا انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کر انگریزوں نے ہندوستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ایسی ہلاکت خیز اور سفاکانہ کاروائیاں شروع کیں جن سے چنگیز اور ہلاکو کی

خونچکا داستانیں بھی ماند پڑ گئیں، پھر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ اب مسلمانوں کے دلوں پر بھی ڈاکے پڑنے لگے اور ان کی سب سے متاعِ گراں مایہ ایمان کو بھی لوٹا جانے لگا، چنانچہ انگریز حکومت کے زیر سایہ پادریوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنی مشنری طاقتوں کو آزمانا شروع کر دیا اور اسلام کے خلاف ایک ایسی فکری اور تہذیبی یلغار شروع کر دی گئی کہ اگر بروقت اس کی مدافعت کی فکر نہ کی جاتی تو خطرہ تھا کہ کہیں یہ امت سرمایۂ اقتدار سے محروم ہونے کے بعد ایمان سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔

لہٰذا ان پر آشوب اور صبر آزما حالات میں دو قسم کی قیادتیں ابھر کر سامنے آئیں، پہلی قیادت جو خالص طبقۂ علماء پر مشتمل تھی، انہوں نے اس مغربی فتنہ کے سدِباب کے لئے منفی رویہ اختیار کیا، اس سلسلہ میں ان کی فکر یہ تھی کہ دینی جذبہ، اسلامی روح، اسلامی زندگی اور تہذیبِ اسلامی کے جتنے بچے کھچے آثار باقی رہ گئے ہیں ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے، اور یہ لوگ ان علوم کو ہاتھ لگانے پر بھی تیار نہ ہوئے جن میں اہل مغرب کو تفوق اور امتیاز حاصل تھا، گویا یہ مکتبِ خیال ہر اس چیز سے گریز کا داعی تھا جس پر یورپ کی چھاپ اور مغرب کی تہمت ہو، اس کے برعکس دوسری قیادت جس کے علمبردار سر سید احمد خان اور انکے رفقاء تھے، وہ مغربی تہذیب کو بغیر کسی تنقید و ترمیم کے اختیار کر لینے کے پر جوش داعی تھے، انہوں نے گرم جوشی کے ساتھ اس تحریک کا علم بلند کیا، اور انگریزی تہذیب و معاشرت کو اختیار کر لینے کی دعوت دی، ایک طرف قدیم و جدید کی یہ کشمکش تھی اور دوسری طرف ملت کے مختلف مکاتبِ فکر اور فقہی مسالک ایک دوسرے کو تحقیر یا خوف و نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے، جہاں تک نصابِ درس کا تعلق ہے تو اس میں کسی حذف و اضافہ کی گنجائش نہیں سمجھی جاتی تھی، اور جدید دنیا کے علوم و افکار اور علمی تحقیقات کے لئے کوئی روزن کھلا نہیں رہ گیا تھا۔

اسی پس منظر میں وقت کے ایک روشن ضمیر، صاحبِ دل، ذی ہوش عالم مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی تحریک پر مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر انجمن ندوۃ العلماء کے قیام کا فیصلہ ہوا، اس انجمن نے جن بنیادوں پر اپنے سفر کا آغاز کیا، وہ تھیں

مسلمانوں کا باہمی اتحاد، اعلیٰ سیرت و کردار کی تشکیل، مسلمانوں کے مختلف مسائل وامور کے حل کے لئے مختلف مسلک و مشرب کے صحیح العقیدہ علماء کے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی تشکیل، اسلامی اصولوں اور شریعتِ اسلامی کے مقاصد کو سامنے رکھ کر علوم دینیہ کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں جو عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کر سکیں، اور ایسے علماء تیار کرنا جو قدیم و جدید دونوں طبقوں کے اعتماد کے اہل اور احترام کے مستحق ہوں۔

بہر حال ندوۃ العلماء نے جو اصلاحی و تعمیری سفر شروع کیا وہ کامیابی کے ساتھ جاری رہا، یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا کہ اس نے لکھنؤ میں اپنے تخیل اور مقاصد کے مطابق ایک تعلیمی تجربہ گاہ اور دینی درسگاہ کا ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' کے نام سے آغاز کیا جس نے ہر دور میں نامی گرامی فضلاء، عالم و محقق، مفکر و مصنف، مؤرخ و فلسفی، ادیب و اہل قلم، شارح و داعی اور اہل دل علماء پیدا کیے، جنہوں نے وقت کے فتنوں کا جواں مردی و جرأت مندی کے ساتھ مقابلہ کیا، اور اسلامی علوم کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کیا۔

ان تاریخ ساز شخصیتوں میں ایک عالم و فاضل، محقق و مصنف، معلم و مربی، حکیم و فلسفی، صوفی و درویش اور عظیم اسلامی اسکالر مولانا عبدالباری ندویؒ کی ذاتِ گرامی ہے، جنہوں نے اسلامی فکر اور احکامات کی بہتر سے بہتر اسلوب میں ترجمانی کی، تہذیبِ جدید کے زیر اثر پیدا ہونے والے نئے فتنوں قومیت و وطنیت اور مادیت کو بے نقاب کیا، اسلام کی آفاقیت اور ابدیت پر جدید طبقہ کا اعتماد بحال کیا، انکے ذہنی خدشات و شبہات کو تشفی بخش طریقہ سے دور کیا، جدید فلسفہ و نظریات کا دندان شکن جواب دیا، مغربی فلسفہ اور سائنس کا مہارت کے ساتھ مطالعہ کیا، اور بہت کامیاب انداز میں اسلامی نظام زندگی کی برتری ثابت کی، اور مذہب سے سائنس کے ٹکراؤ کے تصور کا ابطال کیا، یہاں تک کہ انہوں نے عظیم محققین و مفکرین کے درمیان اپنا مقام بنایا۔

☆☆☆

ولادت ووطن

مولانا عبدالباری ندویؒ کی ولادت بتاریخ ۱۴؍ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۱؍اگست ۱۸۸۹ء کو "گدیہ"، ضلع بارہ بنکی اتر پردیش میں ہوئی، یہ ہمیشہ سے بڑا مردم خیز گاؤں رہا ہے، اور یہاں بڑے بڑے اطباء، ڈاکٹر، انجینیر اور سرکاری حکام کے علاوہ علماء، فضلاء، صلحاء اور اتقیاء پیدا ہوئے۔ (۱)

خاندان

مولانا عبدالباری اس گاؤں کے اس خاندان کے لعل بے بہا اور گوہر نایاب تھے، جو دنیاوی ثروت ووجاہت کے ساتھ دینداری اور تقویٰ میں مدتوں سے ممتاز چلا آتا تھا، آپ کا خاندانی سلسلہ اس مبارک قبیلہ تک پہنچتا ہے جس کے متعلق حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: "الأنصار شعار والناس دثار" یعنی آپ کا خاندان مدینہ منورہ کا انصاری خاندان تھا۔

آپ کے والد ماجد حضرت حکیم عبدالخالق بارہ بنکویؒ صاحب دل بزرگ تھے، زہد وتقویٰ، متانت وسنجیدگی، تہذیب وشائستگی وراثت میں ملی تھی، اور اپنے زمانہ کے ایک شیخ کامل، ملک العلماء حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے دستِ گرفتہ، مرید بااختصاص اور خلیفہ مجاز تھے۔

آپ کے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، مولانا عبدالباری ندویؒ بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے، آپ کے والد ماجد کے بڑے بھائی حکیم امجد علی صاحب فن طب میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور اس علاقہ کے مشہور طبیب تھے، ان کے اثر سے آپ کے والدِ محترم حکیم عبدالخالق صاحب "گدیہ"، ضلع بارہ بنکی میں طبیبِ ریاست مقرر ہوگئے۔

آپ کی والدہ ماجدہ صدیقہ بی خداترس، خدارسیدہ، بڑی نیک سیرت اور اعلیٰ صفات وخصوصیات کی حامل خاتون تھیں، جن کے مزاج وافتاد میں دین راسخ تھا۔ (۲)

ابتدائی تعلیم وتربیت

مولانا عبدالباری ندویؒ نے ابتدائی تعلیم وتربیت اس زمانہ کے شرفاء کے دستور

کے مطابق گھر پر پائی، اس کے بعد ۱۹۰۲ء میں ندوۃ العلماء میں جس کا قیام ابھی چند سال پہلے ہوا تھا داخلہ لیا، ندوہ میں درجہ سوم میں داخلہ ہوا اور پھر یہاں تعلیم مکمل کی، اس تعلیم کے دوران بعض مضامین میں کمزوری کی وجہ سے ان کے والد حکیم عبدالخالق صاحب نے ان کو "نگرام" مولانا محمد ادریس نگرامی صاحبؒ کی خدمت میں بھیج دیا، جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق شیخ التفسیر مولانا محمد اویس صاحب ندویؒ کے دادا تھے، وہ ہمیشہ شکر گزاری کے ساتھ کہتے کہ وہاں جانے سے مجھے بڑا فائدہ ہوا، دینی فائدہ بھی اور علمی وروحانی فائدہ بھی، اور استعداد میں قوت اور استحکام پیدا ہوا۔ (۳)

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی علمی فضاء میں اور علامہ شبلیؒ سے ربطِ خاص

نگرام میں ابتدائی تعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ ہوکر پھر دوبارہ ندوۃ العلماء کی علمی وروحانی فضاء میں داخل ہوئے، اس زمانہ میں یہاں علامہ شبلی نعمانیؒ کا دور تھا، شروع ہی سے ان کی پیشانی پر ذہانت وذکاوت کے آثار ہویدا تھے، اس لئے مولانا شبلی کی نظر جن ہونہار طالب علموں پر پڑی ان میں سے مولانا عبدالباری ندویؒ کی ذاتِ گرامی بھی تھی، یہاں انہوں نے عربی اور علوم دینیہ کی تعلیم کی تکمیل کی، اور تعلیم کے دوران علامہ شبلیؒ سے ان کا ربط خاص رہا، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ کے بعد ان کو علامہ شبلیؒ کی مجلس میں اختصاص حاصل تھا، اور مولانا شبلیؒ کی دور بین نگاہوں نے پہچان لیا تھا کہ یہ لڑکا آگے چل کر آسمان علم وتحقیق میں آفتاب وماہتاب اور سہیل وکہکشاں کی مانند چمکے گا۔ (۴)

جدید علوم کی تحصیل

مولانا عبدالباری ندویؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی اور دینیات کی تعلیم کی تکمیل کے بعد انگریزی زبان کی تحصیل میں منہمک ہوگئے، جس کی ایک بڑی وجہ فلسفۂ جدیدہ میں مہارت پیدا کرکے اس کا رد کرنا بھی تھا، اس وقت یہاں پر بہت ہی جید اساتذہ مسندِ درس پر جلوہ افروز تھے، مولانا فاروق چریاکوٹی، مولانا شیر علیؒ جیسے ہندوستان کے صاحب درس اساتذہ

یہاں درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے، لہٰذا انہوں نے پورے ذوق وشوق اور عزم وحوصلہ سے لبریز ہوکر ان سے ان علوم کو سیکھا، اور یہاں سے باقاعدہ سندِ فراغت حاصل کی، ان کو فلسفہ کا خاص ذوق تھا، جب فلسفہ جدید کے علم کلام اور عقائد پر حملے ہو رہے تھے، اور عقائد میں تزلزل آ رہا تھا، اور علامہ شبلیؒ اس ہراول دستہ کے بھی قائد تھے، جو اس طوفان کے مقابلہ کے لئے سینہ سپر تھا تو مولانا عبدالباری ندویؒ نے بھی اسی مضمون کا انتخاب کیا کہ اس راہ بھی سے دین کی خدمت ہوسکتی ہے۔ پھر انہوں نے فلسفۂ قدیم کے بعد فلسفۂ جدید کا گہرا مطالعہ کیا، انگریزی استعداد بڑھائی اور فلسفۂ جدید کے سمندر میں غوطے لگا کر اس کے نایاب موتیوں کو دین کے قدموں پر لا کر رکھ دیا۔ (۵)

مشاہیر اساتذۂ کرام

مولانا کے مشاہیر اساتذۂ کرام جنہوں نے اس جوہرِ قابل کی تربیت کی، فلسفۂ قدیم کا مذاق پیدا کیا، علم الکلام کے کوچوں سے آشنا کیا، بحث وتحقیق کی راہیں ہموار کیں، کتب بینی اور وسعتِ مطالعہ کا ذوق پیدا کیا، ان میں سرِفہرست علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا فاروق چریا کوٹیؒ، مفتی عبداللطیفؒ، مولانا حفیظ اللہؒ اور مولانا شیر علیؒ جیسے نامور علماء اور یگانہ روزگار فن ہیں۔

دکن کالج پونا میں اور گجرات کالج تبادلہ

مولانا نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک معلم کی حیثیت سے کیا، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ اپنے استاذ جلیل علامہ شبلی نعمانیؒ کی وصیت وحکم کے مطابق دکن کالج پونا کی تدریسی خدمات ترک کرکے اعظم گڑھ آ کر بیٹھ گئے کہ علامہ شبلیؒ کی دیرینہ آرزو ''سیرۃ النبی ﷺ'' کی تصنیف کی تکمیل کریں، تو پونا کے لئے سید صاحب نے مولانا عبدالباری ندویؒ کی خواہش اور اپنی محبت کی بنا پر انکا نام اپنی جگہ پر پیش کردیا جو بلا کسی تردد کے منظور ہوگیا، اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا، اور انہوں نے بجائے فارسی یا اردو کے کلاس میں انگریزی میں لکچر دینا شروع کیا، وہ ''دیوان حافظ'' جیسی بلند اور پراز تلمیحات ورموز کتاب کو انگریزی

ئیں حل کر کے طلبہ کے سامنے پیش کرتے ، پھر انہوں نے فلسفہ کا مطالعہ بھی بہت بڑھالیا اور انگریزی بھی ترقی پاتی رہی، یہاں تک کہ فلسفہ کے ایک اچھے صاحب فکر عالم کی حیثیت سے تعارف ہوا، اور پھر انہیں جو عزت، مقام، شہرت اور اعتماد ملا اس کی وجہ سے حاسدین کی سرگرمیاں تیز ہوگئیں اور الزامات کی ایک طویل فہرست پیش کی گئی جسکی وجہ سے ان کا تبادلہ گجرات کالج احمد آباد کر دیا گیا۔(۶)

گجرات کالج سے وابستگی اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

دکن کالج پونا جواس وقت نہ صرف جنوبی ہند بلکہ ہندوستان میں بڑا مقام رکھتا تھا وہاں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد وہ عرصہ تک گجرات کالج احمد آباد سے وابستہ رہے، یہاں کے قیام کے دوران مسلم ایجوکیشنل کانفرنس احمد آباد میں منعقد ہوئی، تو اسکے جلسہ میں مولانا نے ایک معرکہ آراء اور تحقیقی مقالہ پیش کیا جو بعد میں کانفرنس کی طرف سے ''مذہب وعقلیات'' کے نام سے ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا، ندوہ کے طالب علمی کے زمانہ میں انہوں نے درسیات کے حدود سے قدم باہر نکال کر اس موضوع پر انہوں نے وسیع مطالعہ کیا تھا، پھر مولانا شبلیؒ کی تربیت کی سان پر چڑھ کر فلسفۂ جدید اور علم کلام کا غائر نظر سے مطالعہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ذہن رسا اور نکتہ شناس بنایا تھا، لہذا انہوں نے ''فلسفہ اور عقلیات'' کے حدود بہت جلد متعین کر لئے، یہ رسالہ ان کے مطالعہ کا نچوڑ اور ان کے ذہن کی صفائی اور دراکی کا اعلیٰ نمونہ ہے، اور جو بقول حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ''اسلام کے دفاع کا ایک آہنی قلعہ ہے'' اور بقول حبیب الرحمان خان شیروانی کے ''اس شخص کے ہاتھ پر فلسفہ نے کلمہ پڑھ لیا ہے'' بہر حال مولانا کا یہ رسالہ ان کے دنیاوی عروج کا زینہ بنا، اور اس کے ساتھ دینی ترقی کا ذریعہ بنا۔(۷)

قیام حیدر آباد اور کامیاب ترین تراجم

جب مولانا عبدالباری ندویؒ کی قابلیت کا سکہ قائم ہوگیا تو جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کو

ایک فلسفہ کے استاد کی ضرورت تھی تو مولانا صدر یار جنگ کی خواہش سے وہ وہاں بلالئے گئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کسی یونیورسٹی میں کوئی کسی اعلیٰ ڈگری کے بغیر وہاں اسٹاف میں نہیں آسکتا تھا گویا ان کا تقرر ایک ناممکن سی بات تھی، کیونکہ ان کے پاس ندوہ کے ماسوا کسی اور عصری ادارہ کی ڈگری نہیں تھی، لیکن مولانا عبدالباری ندویؒ اپنی علمی صلاحیت وقابلیت کے اثر سے وہاں کے استاد مقرر ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں وہاں ان کے علم کی دھاک اور ذہانت کا سکہ بیٹھ گیا، اور دارالترجمہ سے ان کا تعلق قائم ہوا اور انہوں نے وہاں بڑے مفید کارنامے انجام دیئے، اور ان کی ایک معرکہ آراء کتاب ''فہم انسانی'' کے نام سے شائع ہوئی، اور برکلے کا ترجمہ کیا، یہ سب فلسفہ کی کتابوں کے کامیاب ترین تراجم کا نمونہ ہیں، ایک طرف تو تحریر کی شگفتگی اور قلم کی روانی جوان کو مولانا شبلیؒ سے ورثہ میں ملی تھی، اور ندوہ کی دین تھی، پھر اودھ کا شگفتہ ادبی ذوق اور ذہانت اور اس کے ساتھ علم کی سنجیدگی اور مطالعہ کی گہرائی ان سب نے مل کر ان کے تراجم کو نمونہ کی حیثیت دی اور وہ وہاں مقبول ہوئے اور فلسفۂ جدید کی صدر نشینی سے سرفراز ہوئے۔(۸)

مولانا عبدالباری ندویؒ اور تحریکِ ندوۃ العلماء

تحریکِ ندوۃ العلماء جن اغراض ومقاصد کے تحت جلوہ گر ہوئی تھی، ان میں ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ ایسے نبض شناس علماء اور فضلاء تیار کئے جائیں جو دینی علوم میں رسوخ کے ساتھ عصری علوم سے بھی واقف ہوں جس کے نتیجہ میں دارالعلوم کا قیام ناگزیر سمجھا گیا کہ جس کے بغیر اس اہم مقصد کو بروئے کار نہیں لایا جاسکتا تھا تو اس دارالعلوم کے اولین باکمال واہل نظر علماء میں ایک مولانا عبدالباری ندویؒ تھے جو اپنی جامعیت کے ساتھ ساتھ پاک ذات وپاک صفات تھے، دبستان ندوہ ان کی ذات میں پوری طرح سے جلوہ گر تھا، وہ ہماری علمی انجمن کا ایک روشن چراغ تھے، وہ دبستان شبلی کے ترجمان اور بزم سلیمانی کے رازداں تھے، وہ ندوہ کے مقاصد کے علمبردار تھے، ندوہ کو ایک عظیم تحریک، ایک اعلیٰ نصب العین کا ترجمان، ایک انداز فکر، ایک دبستان کا نقیب اور علمی میراث کا آئینہ دار تصور کرتے تھے، مولانا کو اکابرِ

ندوہ سے غیر معمولی واقفیت تھی، ان کے بارے میں مولانا جچی تلی رائے رکھتے تھے۔

چنانچہ مادرِ علمی سے اسی تعلق کی باعث اسکے ابتدائی جلسہ ہائے انتظامی میں جہاں مولانا سید سلیمان ندویؒ اور دارالمصنفین کی خدمات کو پیش کیا گیا وہیں مولانا عبد الباری ندویؒ کی خدمات وتحقیقات اور تصنیفات کا بڑے اہتمام کے ساتھ ذکر کیا گیا، مولانا اسحق جلیس ندوی مدیر ''تعمیر حیات'' نے انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''انہیں اپنے مادرِ علمی ندوۃ العلماء سے گہرا تعلق تھا''۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پچاس سالہ جشن تعلیمی میں اپنی شدید علالت کی وجہ سے شرکت فرمانے سے قاصر رہے، مگر ان کو ندوۃ العلماء سے جس کے وہ قابل فخر سپوت تھے جو تعلق تھا اس کے باعث اس موقع پر یہ خلا پوری طرح محسوس کیا گیا، اور اس کو پر کرنے کی اس طرح کوشش کی گئی کی ان کی علمی و دینی خدمات کو پیش کر کے پوری طرح یاد تازہ کی گئی۔(۹)

دارالمصنفین سے علمی وانتظامی ربط

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرح ابنائے ندوہ کے دوسرے بڑے مرکزِ علمی دارالمصنفین اعظم گڑھ سے بھی ان کا علمی وانتظامی طریقہ سے ربط رہا، البتہ وہ اپنی معذوریوں کی وجہ سے انتظامی رابطہ مسلسل قائم نہ رکھ سکے، اور استعفیٰ دے کر لکھنؤ میں یکسو ہو کر رہنے کو ترجیح دی، لیکن علمی مشوروں اور مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھا، جس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ان کی مفید علمی وتحقیقی کتابیں سامنے آتی رہیں۔(۱۰)

سفرِ حج

مولانا عبد الباری ندویؒ کا تعلق ایسے خاندان سے تھا جس کے افراد دینی غیرت وحمیت سے معمور اور حبِ نبوی ﷺ سے سرشار تھے، والد ماجد بڑے ذاکر وشاغل اور والدہ محترمہ ایک برگزیدہ اور پاکیزہ صفات خاتون تھیں، چنانچہ جب مولانا نے ۱۹۲۸ء میں حج

بیت اللہ کا عزم مصمم کیا تو انہوں نے اپنے والدین کو ساتھ لیا، دوسری طرف ان کے دیرینہ وباکمال رفقاء میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا دو آتشہ تھا، ہر ایک نے بڑے سرور ونشاط اور عشق ومحبت میں ڈوب کر اس مقدس فریضہ کی ادائیگی کی۔

ان میں دو بزرگوں نے بڑے مؤثر انداز میں احوالِ سفر لکھے جو وہاں کی حاضری کا شوق پیدا کرنے اور آدابِ زیارت وقیام سے آگاہ کرنے میں مہمیز کا کام دیتے ہیں، ''سفر حجاز'' مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تصنیف ہے، اور ''دربارِ نبوت کی حاضری'' مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا تاثر نامہ ہے۔(۱۱)

تصوف وسلوک

مولانا عبدالباری ندویؒ نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں تو ان کے گھر میں تصوف کی تجلیات تھیں، مولانا کے والد حضرت عبدالخالقؒ حضرت مولانا محمد نعیم فرنگی محلی نور اللہ مرقدہ کے مرید وخلیفہ تھے، جنہوں نے مولانا کی دینی تعلیم کے ساتھ ان کے اخلاق وروحانی پہلو پر توجہ رکھی، مولانا کو گو ابتدا ہی سے عقلیات وفلسفہ سے زیادہ لگاؤ رہا؛ مگر طبعی مزاج دنیا سے بے رغبتی وکنارہ کشی ہی کا تھا جو آخرت طلبی اور زہد وورع کی بنیاد ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے تعلق سے جب مولانا کا قیام حیدر آباد میں ہوا تو مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی رفاقت میں مولانا کو دکن کے مشہور عارف وشیخ محمد حسین چشتی نور اللہ مرقدہ کی روحانی صحبتیں میسر آئیں، لیکن چونکہ وہ بحر فلسفہ کے شناور تھے، اس لئے یہ صحبتیں ان کے قلب کو تسکین سے لبریز نہ کر سکیں، لہذا وہ تسکین قلب اور روحانی تشنگی کو بجھانے کے لئے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے آستانہ میں حاضر ہوتے ہیں، اور ان کی صحبتوں اور مجلسوں سے مستفید ہوتے ہیں، لیکن تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا کہ مولانا عبدالباری ندویؒ کی ''کشود کار'' حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ کے ہاتھوں ہو، حضرت تھانویؒ تک پہنچنا آسان نہ تھا، ایک مشہور یونیورسٹی کا پروفیسر، برکلے، ہیوم، آنسٹائن کے نظریات پر بحث وتنقید کرنے والا فلسفی ومحقق، اسلامیات کا ماہر، عربی وفارسی پر دسترس رکھنے والا صاحبِ نظر جب تک اپنی ''انا'' کو

ذبح نہ کرے، اور نفس کی موٹی گردن کو پاؤں سے کچل نہ دے، تھانہ بھون کی طرف جانے والی پل صراط کو پار نہیں کرسکتا تھا، اس کے لیے ذہانت کی ضرورت تھی نہ ہمت کی، بلکہ اس کے لئے درکار تھی عزیمت، وہ عزیمت جس کو قرآن کی معجزانہ زبان میں مقام مدح میں بیان کیا گیا ہے ﴿إن ذلك من عزم الأمور﴾ انہوں نے اس منزل کو جس عزیمت سے طے کیا یہی ان کی روحانی ترقیات کی کلید تھی۔

حکیم الامت حضرت شاہ تھانویؒ کی کیمیا اثر نگاہ نے مولانا کو ایک زاہد، عابد، قانع، متوکل، اور فانی کامل، سالکِ مجذوب تو بنایا ہی کیونکہ یہ اشرفی خوانِ فیض کی عطائے عام تھی، مگر مولانا کی انفرادیت ایک اور جہت سے قائم ہوئی وہ یہ کہ مولانا پر ''ربوبیت'' منکشف ہوگئی، اب وہ فلسفہ کا مطالعہ کرتے تو ان کو حضرت تھانویؒ کے ملفوظات کی روشنی میں جانچتے، اقتصادیات ومعاشیات کی کوئی گتھی نظر آتی تو اس کو حضرت تھانویؒ کے ناخن تدبیر سے حل کرتے، تعلیم وتربیت کا کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ حضرت تھانویؒ کے مذاقِ تربیت کو عنوان بنا کر اس پر گفتگو کرتے۔

پھر وہ حضرت حکیم الامت کے ہی ایک ممتاز خلیفہ اور اپنے عہد کی ایک مصلح وربانی شخصیت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی خدمت میں ایک مریض روحانی بن کر جاتے ہیں اور یہ پیغام دے جاتے ہیں کہ انسان خواہ کتنا ہی علم وعمل اور اصلاح وتربیت کی راہوں سے گزر جائے، جب تک وہ اس کرۂ ارضی میں ہے شیطان کے نئے نئے باطنی امراض کے پیدا ہونے کے خطرات ختم نہیں ہوتے ہیں کہ وہ اپنے کو طبیبِ روحانی سے آزاد کرالے۔ (۱۲)

محبین ومستفیدین

مولانا عبدالباری صاحب کے مشائخ ومریدین کے تذکرہ کے بعد ضروری ہے کہ ان کے ان عقیدت مندوں کا بھی ذکر آجائے جنہوں نے ان سے کسبِ فیض کیا تھا اور اس کے بعد انہیں ان سے سندِ امتیاز واعتماد بھی ملی، ان میں ایک اہم نام مولانا ڈاکٹر غلام محمد حیدر آبادی (کراچی) کا ہے جنہوں نے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں ان سے شرفِ تلمذ حاصل کیا، پھر حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے ارادت کا تعلق قائم کیا، اور ان کے مجاز وخلیفہ بھی

ہوئے، سید صاحب کی وفات کے بعد وہ اپنے استاد مولانا عبدالباری ندویؒ سے مستفید ہوتے رہے، اوران کا ان سے یہ تعلق بڑا مضبوط اور گہرا قائم ہوگیا، اوران کی جانب سے اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے ،ان کے علاوہ بھی پابندی سے خدمت میں حاضر ہونے والوں میں مولانا اسحٰق جلیس ندوی، مولانا مفتی محمد ظہور ندوی اور مولانا برہان الدین سنبھلی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

علمی کے ساتھ روحانی استفادہ کرنے والوں میں بھٹکل کے ڈاکٹر علی ملپا صاحب اور مولانا محمد مبین ندوی (کوپا گنج مئو) کے نام قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ اور بھی حضرات ہیں جنہوں نے ان کے بلند پایہ علمی ودینی مقام کی قدر کی اور کسبِ فیض کیا۔ ان میں سرفہرست حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس) ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی، مولانا اشتیاق احمد ظلی اور ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی ہیں۔ (۱۳)

وفات

بروز جمعہ ۲۷ محرم الحرام ۱۳۲۶ھ مطابق ۳۰ جنوری ۱۹۷۶ء کی صبح عالم اسلام کی نابغۂ روزگار شخصیت، میدانِ تحقیق کے شہسوار اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے لائق فخر سپوت کی کتابِ زندگی کا ورق پلٹ گیا اور لاکھوں محبین ومعتقدین کو افسردہ چھوڑ کر اپنے محلّہ کے قبرستان ڈالی گنج میں آسودۂ خاک ہوئے۔ (۱۴)

نمایاں اوصاف وکمالات اور امتیازی خصوصیات

قرآن کریم اوراس کی تعلیمات سے آپ کو بے پناہ عشق اور والہانہ تعلق تھا، خود بھی قرآن کریم کی تلاوت کثرت سے کرتے تھے اور اپنے تمام متعلقین ومتوسلین اور مریدین کو بھی تلاوتِ قرآن کریم کی ترغیب وتلقین کرتے تھے، مطالعہ اسی کے سلسلہ میں کرتے، درس اسی کا دیتے، آپ کے درس کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے مفکرِ اسلام حضرت مولانا

ابوالحسن علی حسنی ندویؒ قمطراز ہیں:۔

مولانا کے درس میں ایسے حکیمانہ اشارے ملتے ہیں جن کی شرح میں صفحہ کے صفحہ بلکہ رسالے لکھے جاسکتے ہیں۔

قرآن کریم کی طرح سنتِ نبوی ﷺ سے بھی آپ کو بے حد عشق تھا، ہر کام میں سنت کا لحاظ کرتے اور ترغیب دیتے، نمازوں میں اعتدال، خشوع وخضوع، اور سنن ومستحبات کا پاس ولحاظ کرتے، اسی طرح ادعیۂ ماثورہ اوراذکار مسنونہ کا بھی خصوصی اہتمام کرتے۔(۱۵)

تواضع وللّٰہیت

مولانا اپنے علمی کمال، روشن دماغی اور خوشحالی کے باوجود خلوص وللّٰہیت کی دولت اور معرفتِ الٰہی کی نعمت سے سرشار تھے۔

مولانا منظور نعمانیؒ ان کی مجموعۂ کمالات وجامع صفات شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولانا عبدالباری ندوی عظیم ونامور فلسفی ہونے کے باوجود بھی تواضع وسادگی، خلوص وللّٰہیت اور خاکساری وفروتنی کا حسین پیکر تھے، سچ پوچھئے تو ان کی سادگی میں ایک جلال تھا، خاکساری میں ایک وقار، فروتنی میں ایک دبدبہ تھا۔

مولانا ماہر القادری مدیر ''فاران'' کراچی لکھتے ہیں:۔

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کے چہرہ سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دینداری ان کی گھٹی میں پڑی تھی، فلسفہ کے ساتھ خانقاہی ذوق آب وآتش کا اجتماع تھا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مولانا صرف ایک بڑے عالم، محقق ومصنف ہی نہیں بلکہ ایک صاحبِ حال بزرگ اور صاحبِ نسبت شیخ بھی تھے۔ (۱۶)

دینی وایمانی غیرت وحمیت اور مسلکِ صحیح کی حفاظت کا اہتمام

اللہ تعالیٰ نے کچھ تو فطری طور پر اور کچھ خاندانی اثرات اور کچھ حضرت تھانویؒ کی

صحبت وخدمت میں رہنے کی وجہ سے مولانا کی طبیعت میں دین کی محبت اور اپنے اسلاف اور علماء حق کے مسلک سے وابستگی اور اس کے بارے میں غیرت وذکاوت حس شروع سے ودیعت فرمائی تھی۔

روئے زمین پر جب بھی کہیں دین کے بقاء و وجود اور مسلمانوں کی جداگانہ وملی اسلامی شخصیت کے لئے کوئی خطرہ پیش آتا تو آپ کی طبیعت بے چین ہو جاتی اور آپ کا دل دردمند ہو جاتا، قریبی لوگوں سے اس کا اظہار کرتے، تبادلۂ خیال کرتے، اپنا صحیح موقف پیش کرتے اور جہاں تک ممکن ہوتا خود کوشش کرتے اور اہل اثر اشخاص کو اسکی جانب متوجہ فرماتے۔

دینی ودنیوی جامعیت

مولانا عبدالباری ندویؒ کا ایک امتیازی وصف دینی ودنیوی جامعیت ہے، دینی شعور واحساس، ایمانی فراست وبصیرت کے ساتھ دنیوی شعور، یعنی عقل دینی اور عقل دنیوی دونوں ہی سے وہ آراستہ تھے۔(۱۷)

اعلیٰ ادبی ذوق

ایک طرف اللہ تبارک تعالیٰ نے آپ کو بلند علمی مقام سے سرفراز فرمایا تھا تو وہیں دوسری طرف اعلیٰ درجہ کا ادبی ذوق بھی عطا فرمایا تھا، یہ ذوق انہیں اپنے استاد ومربی علامہ شبلی نعمانیؒ سے ملا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ رقمطراز ہیں:۔

فکر وفہم حضرت تھانویؒ سے لی ہے، اور اندازِ تحریر مولانا شبلیؒ سے۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ان کے اس وصف کا اعتراف کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:۔

وہ دبستان شبلی کے ایک کامیاب وممتاز ادیب وصاحب قلم تھے، تحریر میں پختگی وشگفتگی، زبان وادب کی چاشنی، جملوں کی برجستگی دونوں پہلو بہ پہلو ہوتے،

اور یہی مولانا شبلیؒ کی تربیت کا فیضان تھا۔

بہر کیف یہ دونوں اقتباسات اس بات کے غماز ہیں کہ وہ ایک صاحب فکر ادیب اور اعلیٰ ادبی ذوق کے حامل تھے۔(۱۸)

اسلوبِ تحریر

حضرت مولانا برِ صغیر کے مستند اور معتمد مصنفین میں تھے، وہ زبان وادب، الفاظ ومحاورات اور تشبیہات واستعارات کے استعمال میں سند کا درجہ رکھتے تھے، علم وتحقیق میں ان کا پایہ بہت بلند تھا بڑی سلیس وشگفتہ اور شستہ نثر لکھتے تھے، کم سے کم الفاظ کے استعمال سے معانی وحقائق کی کثرت کے مظاہر پیدا کرتے تھے۔(۱۹)

علمی خدمات-ایک جائزہ

مولانا عبدالباری ندویؒ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، جس میں علم وفن، تحقیق وتصنیف، اور تجدید واصلاح کے نادرونایاب گلدستے، تحقیقی وعلمی خدمات کے بلند منارے، دینی ومذہبی مسائل میں رہبری وقافلہ سالاری کے انمول نمونہ قرینے سے سجے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہ گوناگوں صفات مولانا کی ذات میں اس طرح جلوہ گرتھیں کہ جیسے آپ کی شخصیت ایک کہکشاں ہوں جس میں علم وفن اور دعوت وارشاد کے ہزاروں تارے چمک رہے ہوں، اور جس کی نیر تابی وضوفشانی سے ہم آہو وان منزل اپنے کام ودہن کو شاد کررہے ہوں، لیکن اصلاً آپ محقق تھے، اور تحقیق وتدقیق آپ کے مزاج میں اس طرح رچ بس گیا تھا کہ آپ کا کوئی عمل بھی اس کے اثر سے خالی نہ ہوتا، علم وتحقیق کے میدان میں حضرت مولانا نے جو تحقیقی اور تصنیفی جوہر دکھائے ہیں اس کا اندازہ آئندہ صفحات سے ہوگا۔

تصنیفات-تعارف وتبصرہ

مولانا نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں علم وتحقیق کا دریا بہایا ہے، اس طرح آپ نے علم کا بہت بڑا سرمایہ لٹریچر کی صورت میں جمع کردیا ہے،

آپ کی تمام تحریریں اپنے فن اور موضوع میں مستند ومعتبر سمجھی جاتی ہیں جو بعد میں افادۂ عام کی خاطر زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر آ گئیں۔

ذیل میں مولانا کی کتابوں کا بالترتیب ذیلی عناوین کے ساتھ تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

تراجم اور مبادیٔ علومِ انسانی

مولانا نے فلسفہ، نفسیات اور اخلاق کی بعض اہم انگریزی تصانیف کے جو ترجمہ کیے ہیں، ذیل میں ان کی فہرست ملاحظہ ہو:

(۱) ''مبادیٔ علومِ انسانی'' یہ BARCLY کی کتاب'' PRINCIPLES OF HUMANKNOWLDOGE '' کا ایسا کامیاب ترجمہ ہے جس پر انہیں علمی ودینی حلقوں سے بڑی دادِ تحسین ملی، اور جو افراد اسلامی عقائد وافکار کے سلسلہ میں شکوک وشبہات کا شکار ہورہے تھے اس سے ان کو اطمینان حاصل ہوا اور اسلام پر نئے سرے سے ان کا اعتماد بحال ہوا۔

(۲) ''علم الاخلاق'' یہ MACKENZISJ.S کی کتاب MANUAL OF ETHICS کا ترجمہ ہے۔

(۳) ''فلسفہ نتائج'' یہ مشہور فلسفی JAMES WILLIOM کی تصنیف ''PRAGMATIS M'' کا ترجمہ ہے۔

(۴) ''فہمِ انسانی'' یہ عظیم محقق ''HUMAN UNDERSTANDING'' کی انقلابی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۵) '' مقدمہ ما بعد الطبیعات'' یہ BERGSON NEWRE نامی مصنف کی کتاب ''ANINTRODUCTION TO METHOPHYOSICS'' کا ترجمہ ہے۔

(۶) '' طریق اور تفکرات'' یہ DECARTERENE کی تصنیف ''DISCOURSES ON METHODSAND'' کا ترجمہ ہے۔

(۷) ''اخلاقیات'' یہ DEHO J.B.JHTAFTS کی کتاب ''METAPHYBICAL MEDITATION ETHICS'' کا ترجمہ ہے۔

(۸) ''حدیقۂ نفسیات'' یہ STOUT کی کتاب'' MANUAL OF PHYCHOLOGY'' کا ترجمہ ہے۔ (۲۰)

تراجم کا امتیاز اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کا اعتراف

مولانا عبدالباری ندویؒ کے تراجم کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان پر ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا، مولانا بڑے سے بڑے فلسفی اور ماہر نفسیات کے خزانۂ خیال اور طرزِ ادا پر اس طرح قبضہ جما لیتے ہیں اور انگریزی محاورات کو اردو محاورات میں اس خوبی سے منتقل کر لیتے ہیں کہ ان کے تراجم مصنفین کی اصل کتاب ہی محسوس ہوتے ہیں، اور بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ ''مولانا عبدالباری کے تراجم کا کوئی بدل نہیں، ترجمہ کی خوبی تو یہی ہے کہ وہ ترجمہ محسوس ہی نہ ہو۔'' (۲۱)

فلسفیانہ محاکمات ومقدمات

تراجم کے علاوہ مولانا کے فلسفیانہ محاکمات ومقدمات ان کے تبحر فن کے شاہد ہیں جو ان کے مقالات ''معجزات انبیاء اور عقلیات جدیدہ''، ''مذہب وعقلیات'' اور تصنیف ''مذہب اور سائنس'' اور تحریر کردہ مقدمات میں جا بجا ملتے ہیں۔

فلسفیانہ تصانیف

ذیل میں مولانا ندویؒ کی فلسفیانہ تصانیف کے بارے میں مختصر معلومات درج ہیں:

(۱) معجزات انبیاء اور عقلیات جدیدہ

یہ مقالہ سیرۃ النبی ﷺ جلد سوم صفحہ ۱۱۷ سے صفحہ ۲۱۰ تک پھیلا ہوا ہے۔

اس میں امکانِ معجزات، شہاداتِ معجزات، استبعادِ معجزات، یقینِ معجزات اور غایتِ معجزات کی جلی اور نمایاں عنوانات کے تحت جدید فلاسفہ، معقولین اور سائنس دانوں

کے افکار وخیالات کا تجزیہ اوران پر محاکمہ کرتے ہوئے منکرین معجزات کے مدلل جوابات دئے گئے ہیں، دینی لٹریچر خصوصاً موضوع سیرت کے عظیم عالمی تحریری ذخیرہ میں یہ مقالہ اپنی نوعیت کا پہلا مقالہ ہے، اوراس وقت تک غالبًا آخری علمی کارنامہ ہے۔ (۲۲)

(۲) مذہب اور سائنس

یہ مولانا کی عمر کی آخری تصنیف ہے، اوران کا شاہکار ہے بلکہ اس موضوع پر یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد تصنیف ہے جو مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے شائع کی، اس پر عصر عاضر کے ماہر طبیعیات اور مشہور فاضل ریاضات ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی کا فاضلانہ اور محققانہ مقدمہ ہے، جنکی شہادت اور تحسین کتاب کو ہر تحسین غیر سے مستغنی کرتی ہے، ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ'' مولانا کا مطالعہ کس قدر وسیع رہا ہے اور انہوں نے قدیم یونانی فلسفہ سے لے کر آج تک بڑے بڑے علماء وحکماء کی تصنیفات اور مقالات سے اپنے موضوع کے متعلق کس طرح قیمتی مواد حاصل کیا ہے اور پھر اس مواد کی تحلیل کے بعد ایک مدلل پیرایہ میں کیسے صحیح نتائج اخذ کئے ہیں''۔ (۲۳)

اس کتاب میں ان کا قدیم شبلوی اسلوب پھر جاگ اٹھا ہے اوران کے اشہب قلم کو اپنی بھولی ہوئی راہیں یاد آگئیں ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ یہ ایک عالم ہوش اور صلاحیت فکر وتحریر کی آخری یادگار ہے۔ (۲۴)

(۳) مذہب وعقلیات

یہ مولانا کا بہت مشہور ومقبول اور بے نظیر مقالہ ہے، یہی وہ مقالہ ہے جسکو نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانیؒ حضور نظام کے سامنے یہ کہ کر پیش کیا تھا کہ'' سائنس نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے۔''

مذہب وعقلیات کے عربی ترجمہ جو مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے کیا ہے،

کو پڑھ کر ایک عرب عالم نے جو ایک عرب یونیورسٹی کے شعبۂ عقیدہ کے سربراہ تھے اس کی افادیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ:۔

''یہ کتاب تو عقیدہ کے نصاب میں داخل ہونے کے لائق ہے۔''

اور ہندوستان کے سب سے عظیم علمی وروحانی شخصیت حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا تھا:۔

یہ مذہب کا آہنی قلعہ ہے، اگر اب بھی اس میں کوئی پناہ نہ لے تو اس کی مرضی۔

اس مقالہ میں مادیت اور دہریت کی تردید کی گئی ہے، اور ثابت کیا گیا ہے کہ عقل و مذہب کے مابین تطبیق کی کوشش ایک سعی لاحاصل ہے، نیز مذہب و سائنس میں تصادم کے خیال کو اس قدر مضحکہ خیز قرار دیا گیا ہے جتنا کہ ریل گاڑی اور سمندری جہاز میں تصادم کا تصور کیا جا سکتا ہے، کیونکہ مذہب جہاں سے شروع ہوتا ہے سائنس کی رسائی وہاں ختم ہو جاتی ہے، اور سائنس کا جو منتہائے پرواز ہے وہ مذہب کا نقطۂ آغاز ہے۔ بہر کیف یہ رسالہ ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے، اپنے موضوع پر البیلا، منفرد اور شاہکار ہے۔ (۲۵)

(۴) کلامیات سائنس

مولانا کی یہ کتاب مکمل تو ہو گئی تھی؛ مگر نظر ثانی باقی تھی، اس لیے چھپنے سے رہ گئی، اب معلوم نہیں کہ یہ مایہ ناز تصنیف کہاں ہے، محفوظ بھی ہے یا نہیں، واللہ اعلم۔ (۲۶)

فلسفیانہ تصانیف کا اسلوب

حضرت مولانا نے ان میں جدید نفسیات اور فلسفہ سے تقابل کے ساتھ حضرت تھانویؒ کے گہرے فلسفیانہ امتیاز کو آشکارا کیا ہے اور استدلالی زبان اختیار کی ہے۔ (۲۷)

صوفیانہ تصانیف

حضرت تھانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے معقول ومنقول علوم، حقائق اسرار اور معرفت، بشری نفسیات اور تربیتِ نفس کی باریکیوں، مسلمانوں کے اجتماعی امراض اور ان کے معالجات کے

تعلق سے بڑی زبردست صلاحیت عطا فرمائی تھی، اور حضرت نے عملی واصلاحی کام کے علاوہ بلند پایہ تحریری سرمایہ چھوڑا ہے، ان کے خلفاء میں یہ جذبہ عام نظر آتا ہے کہ:۔

دل میں لگائے ان کی لو کر دے جہاں میں نشرِ ضو
شمعیں تو جل رہی ہیں سو بزم میں روشنی نہیں

مولانا عبدالباری ندویؒ میں بھی بہ ہمہ علم و آگہی یہ جذبہ جنون عشق کے درجہ تک پیدا تھا، انہوں نے اپنے علمی کمالات، شیخ کے علوم و معارف اور تجدیدی کارناموں کے جمع و ترتیب اور شرح و تہذیب میں وقف فرمادیئے اور پانچ عنوانات کے تحت شیخ کے تجدیدی کام کو مسلمانوں کے سامنے پیش فرمایا، اسکی تفصیل ذیل میں نقل کی جاتی ہے:۔

(۱) جامع المجددین (تجدید دین کامل)

۴۶۴ صفحات پر مشتمل جب یہ کتاب پہلی بار ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آئی تو حضرت تھانویؒ کے حلقہ سے اس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس پر ایک جامع، عالمانہ و محققانہ مقدمہ لکھا، جس میں مجددین اسلام کی مختصر تاریخ بیان فرمادی، اور دکھایا کہ تاریخ اسلام میں کب کس کو مجدد کہا گیا ہے، حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ نے اپنے شیخ، مربی اور زمانہ کے مجدد و حکیم حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اصلاحی و تجدیدی کارناموں کا جائزہ لیا ہے، اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انہوں نے زندگی کے مختلف میدانوں میں تجدیدی و اصلاحی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

البتہ جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ لوگ کتاب کے اس نام سے تشویش ذہنی کے شکار ہو رہے ہیں تو انہوں نے اس کا نام بدل کر ''تجدید دین کامل'' رکھ دیا۔ (۲۸)

(۲) تجدید تصوف و سلوک

اس کتاب کا نیا ایڈیشن ۳۹۶ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ فن تصوف جو جوہر سے خالی ہو گیا تھا، اور محض رسوم و بدعات یا چند فلسفیانہ خیالات کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا،

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ طریقت وشریعت کو دو متقابل حریف ٹھہرالیا گیا تھا، اور قرآن وسنت سے بے نیازی حاصل کرلی گئی تھی، حکیم الامت، مجدد ملت حضرت تھانویؒ کے ذریعہ دوبارہ یہ فن شبلیؒ وجنیدؒ اور بسطامیؒ وجیلانیؒ جیسے پایہ کے اولیاء کرام کے خزانوں سے معمور ہو گیا اور یہ وہ شان تجدید تھی جو اس صدی میں مجددِ وقت کے لئے اللہ تعالیٰ نے مخصوص فرمائی تھی۔

مولانا کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، اس کا عربی ترجمہ قدرے تلخیص کے ساتھ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے کیا اور مکتبہ دارالفتح دمشق سے ''بین التصوف والحیاۃ'' کے عنوان سے پہلی بار ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا، اس عربی ترجمہ کا پھر ترکی زبان میں ترجمہ ہوا، اس طرح کتاب کے ذریعہ عرب دنیا اور اہل ترکستان حضرت تھانویؒ کی تجدیدی تعلیمات سے روشناس اور فیضیاب ہوئے۔(۲۹)

(۳) تجدید تعلیم وتبلیغ

یہ کتاب تقریباً ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب میں جدید فلسفۂ تعلیم کے غلط نتائج اور اس کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے اسلامی نظریۂ تعلیم کی خوبی کو بیان کیا گیا ہے اور جدید وقدیم نصاب تعلیم میں اصلاح کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، استدلال زیادہ تر حضرت تھانویؒ کے ملفوظات وارشادات سے کیا گیا ہے۔(۳۰)

(۴) تجدید معاشیات

یہ سلسلہ تجدیدیات کی ایک اہم ترین کڑی ہے، اس کے صفحات ۵۱۸ ہیں جو ۱۹۵۵ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی، یہ ''فن معاشیات'' ہی کی کتاب نہیں بلکہ اس میں جدید معیشت اور ایمانی یا معادی معیشت کے فرق کی وضاحت کے ساتھ اس طور وطریق کی وضاحت کی گئی ہے جس پر ایک مسلم فرد اور جماعت اپنی معیشت کو قائم کرکے اس دنیا اور آخرت کے تسلسل حیات میں تمام تر کامیابی حاصل کرسکتی ہے، مولانا گو ماہر معاشیات نہیں؛ لیکن ایک ماہر فلسفی ہونے کی وجہ سے ان کی نگاہ نے یہاں بھی ایسے نکتے پیدا کئے ہیں کہ اہل فن اس کو پڑھ کر وجد میں آجائیں۔

(۵) تجدیدِ کلامیات

سلسلہ تجدید کی یہ آخری اور اہم ترین کڑی ہے، اس اعتبار سے بھی کہ ''کلامیات'' مولانا کا خاص موضوع تھا اور اس جہت سے بھی کہ جدید علمِ کلام وقت کا مطالبہ ہے، یہ تصنیف مولانا نے مکمل فرمائی تھی؛ مگر چھپ نہ سکی تھی، اور افسوس کہ ابھی تک یہ غیر مطبوع ہی ہے، کاش کہ کوئی اس کی طباعت کی طرف توجہ مبذول کرتا۔ (۳۱)

صوفیانہ تصانیف کا امتیاز

ان تصانیف کا امتیاز یہ ہے کہ حضرت مجدد تھانویؒ کی تعلیمات کا اس قدر مرتب تحلیلی اور تجزیاتی مطالعہ، اور ان کے علوم کی اس قدر صحیح تشریح وترجمانی اس سے قبل نہ کسی نے کی تھی اور نہ آج تک کسی سے بن آئی ہے۔

صوفیانہ تصانیف کا اسلوب

صوفیانہ (تجدیدی) تصانیف میں مولانا کا اسلوب نگارش وہ نہیں جو فلسفیانہ تصانیف کا ہے

بقول مولانا ڈاکٹر غلام محمد کراچی:

> ''اگر مولانا کا عمومی اسلوب ان تصانیف میں بھی قائم رہتا تو تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے تجدیدی تصانیف میں زیادہ کشش پیدا ہوتی ہے۔''

دراصل ان تصانیف میں مولانا پر حضرت تھانویؒ کی عظمت کا اس قدر غلبہ رہا کہ ان کا اسلوبِ تحریر تک اس سے متاثر ہو گیا۔ (۳۲)

قرآنی خدمات

فلسفہ کے بعد مولانا کو سب سے زیادہ شغف قرآن پاک سے تھا اور بصیرت قرآنی سے انہیں حظِ وافر ملا تھا، اس سے انہیں یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں، باقاعدہ تفسیری کام نہیں کیا؛ لیکن دورانِ تلاوت آیات کے معانی ومفاہیم کو ایجاز واحتیاط

کے ساتھ سپردِ قلم کردیا، خیال تھا کہ فرصت پا کر ان کی تشریح لکھیں گے: مگر بیماری کا سلسلہ اس قدر طویل ہوگیا کہ لکھنے کی تاب باقی نہ رہی، پھر بھی مولانا کے ہاتھوں دو قرآنی خدمات انجام پاگئیں جن میں سے ایک چھپ کر خوب مقبول ہوئی اور دوسری چھپ نہ سکی۔

(۱) قرآن کا دو آیاتی نظامِ صلاح واصلاح

یہ دراصل سورہ ''والعصر'' کی تفسیر ہے اور پوری تفصیل کے ساتھ اس کے مضامین کی تشریح بھی اور تذکیر، اور اس کے اجزاء سے ایک مکمل نظامِ صلاح واصلاح مرتب کردیا گیا ہے تاکہ مسلمان اس سے عملی فائدہ اٹھائیں، یہ مولانا کی قرآنی بصیرت کا جامع مرقع ہے۔

یہ کتاب مجلس علمی (کراچی) سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی جو ۲۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔(۳۳)

(۲) کلامیاتِ قرآن

تجدیدِ کلامیات کی طرح کلامیاتِ قرآن بھی مولانا کی بڑی گرانقدر تصنیف ہوتی، بلکہ اس کا درجہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا، مگر قضاء وقدر کا فیصلہ نہیں تھا کہ یہ تصنیف مولانا کے ہاتھوں مکمل ہوتی، غالباً اس کا ایک سبب ''مذہب اور سائنس'' کی تکمیل کا انہماک رہا۔

اب بھی یہ معلوم نہیں کہ'' کلامیاتِ قرآن'' کے عنوان سے کتنے صفحات تحریر فرمائے گئے اور وہ کہیں محفوظ بھی ہیں یا نہیں۔(۳۴)

مولانا عبدالباری ندویؒ بحیثیت فلسفی

ہندوستان میں اسلامی نشأۃ ثانیہ کا دور دراصل شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی علومِ اسلامیہ کے میدان میں فتوحات سے شروع ہوتا ہے۔

بارہویں صدی ہجری میں ان کے ذریعہ اس ملک میں جو علمی اور فکری انقلاب آیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی نشأۃ ثانیہ کے میدان میں ایسے اصلاحی اور تجدیدی کارنامے انجام پائے جو ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے صفحات پر نقشِ زریں کی حیثیت سے ثبت ہیں، آپ

نے علم وتحقیق کے علمبرداروں کی ایک عظیم نسل تیار کی، اور سلسلہ ولی اللّٰہی کے ایسے زبردست علمی وتربیتی مراکز قائم ہوئے جو اس ملک کی علمی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ولی اللّٰہی درسگاہوں کے نام سے معروف ہیں۔

ولی اللّٰہی درسگاہوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے علماء، فضلاء، محققین نے اپنی تحقیقی وعلمی کاوشوں کے ذریعہ اسلامی نشأۃ ثانیہ کے میدان میں قابلِ فخر کارنامے انجام دیے۔

بیسوی صدی عیسوی کے ایک قابلِ فخر فلسفی ومحقق مولانا عبدالباری ندویؒ ہیں جو نہ صرف ہندوستان کی علمی اور تحقیقی تاریخ میں بہت ممتاز اور بلند مقام رکھتے ہیں؛ بلکہ انہوں نے اپنی بے مثال تحقیقی تصنیفات اور فلسفیانہ کارناموں سے ہندوستان کا تعارف مغربی دنیا میں کرایا۔

مولانا عبدالباری ندویؒ ہند اور بیرونِ ہند کی علمی وتحقیقی دنیا میں اپنی غیر معمولی ذہانت وفطانت، وسعتِ علمی اور قدیم وجدید فلسفہ پر گہری نظر کی وجہ سے الحاد ودہریت اور مادیت کے راستہ پر گامزن نسل کا دین وایمان پر اعتماد جس طرح انہوں نے بحال کرایا یہ وہ غیر معمولی کارنامہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ذیل میں ان چند اربابِ کمال کے تأثرات پیش کرتے ہیں جو ان کی فلسفیانہ حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ رقمطراز ہیں:۔

> یہ وہ عبقری شخصیت ہے جس کے قلم سے نصف صدی سے زائد علوم عقلیہ وفلسفہ وسائنس فیضیاب ہوتے رہے، اور انہوں نے سائنس دانوں اور فلسفیوں کو سجدۂ سہو کرا کر ہی دم لیا۔ (۳۵)

مشہور معاصر فلسفی وماہر نفسیات مولانا عبدالماجد دریابادیؒ تحریر فرماتے ہیں:

> فلسفی کہلانے کے مستحق صرف اور صرف باری صاحب ہی ہیں۔ (۳۶)

سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ رقمطراز ہیں:۔

> ہمارے زمرۂ علماء میں فلسفۂ جدید کا واقف کار مولانا عبدالباری ندویؒ

سے بڑھ کر کوئی نہیں۔(۳۷)

مشہور نقاد ماہر القادری مدیر ماہنامہ ''فاران'' (کراچی) نے اپنا تأثر بیان کیا ہے:

فلسفہ کے ساتھ ان کی دینی وابستگی کا اچھا نقش میرے لوح دل ودماغ پر ثبت ہوگیا۔(۳۸)

مشہور عالم ومحدث محمد یوسف بنوریؒ نے مولانا عبدالباری کی رحلت پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:۔

جدید فلسفہ اور جدید الٰہیات پر ان کی نظر اور ہمہ گیری حیرت انگیز ہے، ''سائنس اور مذہب'' جیسی نافع وعظیم تصنیف سے تمام فلاسفہ اور ملاحدہ کے سر پر جوتے لگائے اور حجت پوری کردی، مولانا پیدا ہی فلسفی ہوئے تھے، انہیں طالبِ علمی کے دوران خصوصی دلچسپی فلسفہ وکلام ہی سے رہی۔(۳۹)

اور مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا یہ تأثر بڑی اہمیت کا حامل ہے جو انہوں نے اپنی محسن کتابوں کے تعلق سے ظاہر فرمایا ہے:

مولانا عبدالباری ندویؒ کی ایک چھوٹی سی کتاب ''مذہب وعقلیات'' کے مطالعہ سے عقل ونقل کے حدود اور تجربہ وعلم انسانی کی نارسی وناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا، اس کے بعد قدیم وجدید فلسفہ اور اسکی تاریخ پر جو کچھ پڑھا، مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا بھی تزلزل واقع نہیں ہوا۔(۴۰)

دینی خدمات

ایک عالم وداعی کے لئے ملی وانسانی بہی خواہی کی فکر اور سب سے بڑھ کر نسل نو کے ایمان وعقیدہ کی فکر ایک اہم ذمہ داری بن کر سامنے آتی ہے، اور ربانی علماء نے انفرادی اور اجتماعی طور پر کبھی بھی اس کے لیے کوششوں سے دریغ نہیں کیا۔

چودھوی صدی ہجری کے علماء میں مولانا عبدالباری ندویؒ کو یہ خصوصیت حاصل

رہی ہے کہ انہوں نے مغربی تہذیب کے خطرناک اثرات کا بھی جائزہ لیا اور دانشور طبقہ کی اصلاح وتربیت کے لئے درج ذیل ٹھوس اقدامات کی طرف توجہ دلائی جو مولانا کی اصلاحی ودینی خدمات کے زمرہ میں آتے ہیں، ورنہ ان کی علمی خدمات ہی دراصل دینی خدمات ہیں کیونکہ انہوں نے اپنی علمی تصنیفات کے ذریعہ دین ومذہب کے تعلق سے جدید ذہن کے شکوک وشبہات کو تشفی بخش طریقہ سے دور کیا۔

نسلِ نو کی اسلامی ذہن سازی اولین ترجیحی مسئلہ - تدبیر وتجویز۔

مولانا عبدالباری ندویؒ کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے اختلاط رہا تھا، اور اس کے مضر گوشے ان کے سامنے پوری طرح عیاں تھے، اس کو سنبھالنے اور راہِ راست پر لانے کے لئے ان کی اسلامی ذہن سازی اولین ترجیحی مسئلہ تھا، اس لئے سب سے پہلے جو حل نکالا وہ اسلامی اقامت خانوں کا جگہ جگہ خصوصاً ان مقامات پر قیام کی تجویز تھی جہاں عصری دانش گاہیں اور ادارے ہوں۔

لہٰذا مولانا عبدالباری ندویؒ نے اسکو پوری قوت کے ساتھ پیش کیا، اس تصور کے ساتھ کہ اس راہ سے بھی دینی واصلاحی خدمات کی جاسکتی ہیں۔

کوئی نظریۂ دعوت اپنے عملی ظہور کے بغیر مؤثر نہیں ہوسکتا

جس طرح دنیا کے ہر عمل کی قدر وقیمت اس نظریہ کے تابع ہوتی ہے جس پر وہ مبنی ہو، اسی طرح دین بھی ان اعمال کی کوئی قدر وقیمت نہیں لگاتا جن کی بنیاد صحیح عقیدہ پر قائم نہ ہو، جس طرح دنیا کا کوئی اصول عمل میں لائے بغیر کوئی محسوس ومؤثر حقیقت نہیں بنتا، اسی طرح دین کا کوئی جزء اپنے عملی ظہور کے بغیر نہ دنیوی زندگی کے واقعات میں جگہ پاتا ہے اور نہ اخروی زندگی کی کامل نجات کا ضامن ہوتا ہے، دین ودنیا کی پوری برکات وثمرات کا حصول وظہور ایمان وعمل صالح دونوں کی پوری ہم آہنگی ہی پر موقوف ہے۔ (۴۱)

صلاح واصلاح کی ذمہ داری امتِ محمدیہ پر

ختمِ نبوت کے بعد اب صلاح واصلاح کی ذمہ داری امتِ محمدیہ پر ڈال دی گئی ہے،

کیونکہ وہ من حیث الأمۃ اٹھائی اور نکالی ہی اسی غرض سے گئی ہے کہ ایمان وعمل صالح کا خود بہترین نمونہ ''خیر أمۃ'' بن کر پوری انسانیت ''للناس'' کے حق میں حق وصبر کی تواصی یا معروف کے امر اور منکر سے نہی کے انبیائی فرض کا حق ادا کرے۔ (۴۲)

سارے افراد میں دینی خیر طلبی کے عملی ظہور کی ضرورت

جس طرح کتاب ہدایت نے اپنے نظام ہدایت کو برپا کرنے کے لئے مسلمانوں کی پوری امت پر ایک طرف یہ واجب ٹھہرایا ہے کہ ان میں ہمیشہ ایک خاص و مستقل جماعت موجود رہے جسکا خاص و مستقل کام ہی ہو کہ لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاتی اور معروف و منکر کا امر و نہی کرتی رہے، اسی طرح دوسری طرف اسی کتاب ہدایت پر ایمان لانے والوں پر یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ بلا تخصیص مرد و عورت سارے افرادِ امت آپس میں ایک دوسرے کو معروف کی تاکید اور منکر سے منع کرتے رہیں، یہی ہے وہ دینی خیر طلبی ہے جس کے (مولانا عبدالباری ندویؒ کی زبان میں) عملی ظہور کی ضرورت ہے۔ (۴۳)

حواشی

(۱) حیات عبدالباری، ص ر ۳۷، وتعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ نومبر ۲۰۰۱ء۔

(۲) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب ''حیاتِ عبدالباری'' ص ر ۳۷ ـ ۴۷ وسوانح نقوش حضرت مولانا عبد الباری مشمولہ کتاب قرآن کا دو آیاتی نظام صلاح واصلاح ص ۷ ـ ۸۔

(۳) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ نومبر ۲۰۰۱ء، و''حیاتِ عبدالباری'' ص ر ۴۷ ـ ۷۵۔

(۴) نقوش سوانح از مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی مشمولہ کتاب ''تجدید دین کامل'' ص ر ۸ ـ ۹

(۵) ایضاً ص ر ۹ وتعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ نومبر ۲۰۰۱ء۔

(۶) پرانے چراغ ۲ ر ۱۰۲، ونظام صلاح واصلاح ص ر ۱۰۔

(۷) حیاتِ عبدالباری'' ص ر ۸۶ ـ ۸۸ و پرانے چراغ ص ر ۱۰۳ ـ ۱۰۴۔

(۸) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ ر نومبر ۲۰۰۱م ومحسن کتابیں ص ر ۱۸۱۔

(۹) تعمیر حیات لکھنؤ ستمبر ۱۹۸۰م، وحیاتِ عبدالباری ص ر ۱۱۱ ـ ۱۱۲۔

(۱۰) بحوالہ حیاتِ عبدالباری ص/۱۱۲۔

(۱۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں دربارِ نبوت کی حاضری، وحیاتِ عبدالباری ص ۱۱۴/۱۴۲۔

(۱۲) تفصیل کے لیے دیکھیں: بزمِ اشرف کے چراغ ص/ ۲۷۶ ۔ ۲۷۳ ومعارف اعظم گڑھ دسمبر/۱۹۸۸م وتجدیدِ دین کامل ص/ ۱۲ ۔ ۱۳ .

(۱۳) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حیاتِ عبدالباری ص ۲۰۲/۲۰۴۔

(۱۴) تجدید دین کامل ص/۱۶ وحیات عبدالباری ص/۲۰۸۔

(۱۵) حیاتِ عبدالباری ص/ ۲۳۶ ۔ ۲۴۱ .

(۱۶) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "فاران" کراچی مئی/۱۹۷۶ء وتعمیرِ حیات لکھنؤ ۱۰ فروری ۱۹۷۶ء ومعاصرین

(۱۷) ملاحظہ ہو حیاتِ عبدالباری ص ۲۸۷/۲۹۷۔

(۱۸) بحوالہ معاصرین از مولانا عبدالماجد دریابادی و پرانے چراغ ۲/۱۳۲

(۱۹) بحوالہ تعمیرِ حیات لکھنؤ ۱۰ جولائی ۱۹۸۹ء۔

(۲۰) حیاتِ عبدالباری ص ۲۶۱/۲۶۲ ومعارف دسمبر ۱۹۸۸ء۔

(۲۱) بحوالہ: معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۸۸ء ص/۴۱۱۔

(۲۲) ماہنامہ معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۴۱۳/۴۱۴۔

(۲۳) مذہب اور سائنس ص ۳۳-۴۷۔

(۲۴) پرانے چراغ ۲/۱۲۶-۱۲۷۔

(۲۵) بحوالہ نظام صلاح واصلاح ص/۱۱ ومذہب وعقلیات ص/۱۳-۱۵۔

(۲۶) حیاتِ عبدالباری ص/۳۰۴۔

(۲۷) تعمیر حیات ۱۰ جولائی ۱۹۸۹ء۔

(۲۸) بحوالہ تجدید دین کامل ص/۱۷-۱۸ وماہنامہ معارف اعظم گڑھ (دسمبر ۱۹۸۸ء ص/۴۲۲۔

(۲۹) تجدید تصوف وسلوک ص/۱۶۔

(۳۰) تجدید دین کامل ص/۱۹۔

(۳۱) حیات عبدالباری ص/۳۱۷۔

(۳۲) تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰/جولائی ۱۹۸۹ء۔

(۳۳) معارف اعظم گڑھ دسمبر ۱۹۸۸ء۔

(۳۴) حیاتِ عبدالباری ص/۲۴۴-۲۴۵۔

(۳۵) حیات عبدالباری ص ر۲۴۴ - ۲۴۵۔

(۳۶) حیات عبدالباری ص ر۲۵۴-۲۵۵۔

(۳۷) حیات عبدالباری ص ر۲۵۵۔

(۳۸) یادرفتگاں ۱۶/۲۔

(۳۹) ماہنامہ بینات کراچی اپریل ر۱۹۷۶ء۔

(۴۰) مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ص ر۱۸۱۔

(۴۱) نظام صلاح واصلاح ص ر۶۴۔

(۴۲) نظام صلاح اصلاح ص ر۷۳۔

(۴۳) نظام صلاح واصلاح۔

(محمد سہیل باندوی)

باب دوم

شخصیت وانفرادیت

مولانا عبدالباری ندویؒ
اور مذہب وعقلیات کے ٹکراؤ کا تصور

(مولانا) سید محمد واضح رشید حسنی ندوی(۱)

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين محمد بن عبد الله الأمين، وعلى آله وصحبه أجمعين وبعد!۔

قدیم زمانہ سے یہ خیال چلا آرہا ہے کہ عقلیت اور مذہب میں جوڑ نہیں ہے، فلسفہ اور منطق سے اشتغال رکھنے سے عقیدہ متاثر ہوتا ہے، اسی لیے یونانی فلسفہ کا مطالعہ یا مباحث میسحیت کے اختیار کرنے کے بعد یورپ میں ممنوع قرار دیدئے گئے تھے اور ان سے دلچسپی رکھنا مذہبی پیشواؤں کی نگاہ میں ناقابل معافی جرم قرار دیا گیا تھا، فلسفہ کے غلبہ کے زمانہ میں ان علوم کی کتابیں مقفل کمروں میں محفوظ کردی گئی تھیں اور علمی اور عقلی بحث کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

عباسی عہد میں یونانی علوم سے مسلمانوں نے دلچسپی لی اور ان میں کمال پیدا کیا، مسلمان فلاسفہ اور حکماء نے ان علوم میں صرف رسوخ ہی پیدا نہیں کیا؛ بلکہ ان پر ناقدانہ نظر ڈالی اور تنقیح اور تصحیح سے کام لیا، یعقوب کندی کو فیلسوف العرب اور ابن رشد کو ارسطو ثانی کہا گیا، ہادی اور مہدی کے زمانہ میں فلسفیانہ موشگافیوں سے بعض کے ذہن متاثر ہوئے اور وہ دینی عقائد کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلاء ہوئے، تو انہوں نے فلسفہ کے مطالعہ پر پابندی لگانے کے بجائے اس کے مناظرہ اور علمی مناقشہ کا نظم کیا اور علماء نے اس کے مقابلہ

(۱) معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

کے لیے علمی وسائل اختیار کیے تا کہ عقیدہ وایمان کی حفاظت ہو سکے، فلسفہ کی اس اہمیت کی وجہ سے امام غزالیؒ نے اپنی تمام مصروفیات کو ترک کر کے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا اور ''مقاصد الفلاسفہ'' کتاب لکھی، اس کے بعد جب نقصانات کا اندازہ ہوتو ''تھافت الفلاسفہ'' کتاب لکھی، امام غزالیؒ اپنی کتاب ''المنقذ من الضلال ''میں لکھتے ہیں:۔

فلسفہ کے متعلق رائے قائم کرنے کے لیے پہلے میں نے اس کا تحقیقی مطالعہ ضروری سمجھا، اگر چہ مجھے تصنیف وتدریس کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی تھی، میرے حلقۂ درس میں بغداد میں تین تین سو طالب علم ہوتے تھے، پھر بھی میں نے اس کے لیے وقت نکالا اور دو سال کے اندر اندر میں نے ان کے تمام علوم کا مطالعہ کر ڈالا، پھر تقریباً ایک سال تک ان پر غور وفکر کرتا رہا، میں نے دیکھا کہ ان کے علوم چھ قسم کے ہیں، ریاضیات، منطقیات، طبیعیات، سیاسیات، اخلاقیات اور الٰہیات، ابتدائی پانچ علوم کا مذہب سے نفیاً اور اثباتاً کچھ تعلق نہیں، اور نہ مذہب کے اثبات کے لیے ان کے انکار کی ضرورت ہے، طبیعیات میں ان کے بعض نظریات کا کہیں کہیں مذہب سے تصادم ہوتا ہے، مگر وہ چند چیزیں ہیں، اس سلسلہ میں اصولاً یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ طبیعت اللہ تعالی کے اختیار میں ہے، وہ خود مختار نہیں، البتہ جو لوگ ان علوم ومضامین میں فلاسفہ کی ذہانت اور باریک بینی دیکھتے ہیں، وہ عمومی طور پر ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تمام علوم میں ان کا یہی حال ہوگا، حالانکہ یہ ضروری نہیں، کہ جو شخص ایک فن میں ماہر ہو وہ ہر فن میں ماہر ہو، پھر جب ان کی بے دینی اور ان کے انکار کو دیکھتے ہیں تو محض تقلیداً وہ بھی دین کا انکار واستخفاف کرنے لگتے ہیں، دوسری طرف اسلام کے بعض نادان دوست فلاسفہ کے ہر نظریہ اور ہر دعویٰ کی تردید اپنا فرض اور اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں، حتی کہ طبیعیات کے سلسلہ میں ان کی تحقیقات کا انکار کرنے لگتے ہیں، اس کا ایک مضر اثر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان علمی نظریات وتحقیقات کی صداقت کے قائل ہیں، اور ان کے نزدیک

وہ چیزیں پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہیں، ان کا اعتقاد خود اسلام کے بارے میں متزلزل ہو جاتا ہے، اور بجائے فلسفہ کے ان کار کرنے کے وہ اسلام سے بدگمان ہو جاتے ہیں، لے دیکر جو فن مذہب سے متصادم ہوتا ہے وہ الٰہیات ہے، اسی میں انہوں نے زیادہ تر ٹھوکریں کھائیں ہیں درحقیقت انہوں نے منطق میں جو شرطیں رکھی تھیں ان کو وہ الٰہیات میں نباہ نہیں سکے، اسی لیے اس میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔

بارہویں صدی عیسوی کے بعد یورپ نے علم کا سفر دوبارہ شروع کیا، تو انہی حکماء اور فلاسفہ کے علوم سے استفادہ کیا، اور پھر ان میں اضافہ کر کے ان پر سبقت حاصل کی، کلیسا اور علم کے درمیان جو کشمکش ہزار سال تک رہی، اس کی وجہ سے علم سے اشتغال رکھنے والے مذہب اور اہل مذہب کے مخالف ہو گئے، ان میں سے بعض نے خدا کے وجود سے ان کار کر دیا، اسی طرح کلیسا والوں نے اہل علم کے خلاف معاندانہ موقف اختیار کیا، اور پھر اس ٹکراؤ کو جو خاص حالات اور ماحول کا نتیجہ تھا، حقیقت سمجھ لیا گیا۔

مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ (جنہوں نے فلسفۂ قدیم اور فلسفۂ جدید دونوں کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم و تربیت بھی خالص دینی ماحول میں حاصل کی اور دین کے اولین مصادر پر ان کی گہری نظر تھی) اس ٹکراؤ کو مفروضہ قرار دیتے ہیں اور یہی ان کی علمی شخصیت کا امتیاز ہے، وہ دونوں علوم کے جامع تھے، جس طرح قرون اولی میں مسلمان حکماء و فلاسفہ جن میں امام غزالی اور علامہ ابن رشد کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے دینی موضوعات پر بھی ایسی کتابیں تصنیف کیں جو تربیت نفس سے تعلق رکھتی ہیں، فلسفہ اور فلاسفہ کے مطالعہ کے ساتھ ان کا تربیتی تعلق ان کے عصر کے اہم مشائخ اور اساتذہ سے تھا، جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، شیخ الاسلام حسین احمد مدنی اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی تھے، بعض اہل علم نے ان کو اس عصر کا امام غزالی قرار دیا ہے جنہوں نے "مقاصد الفلاسفہ" کتاب تصنیف کی اور دوسری "احیاء علوم الدین"

جیسی ایمان کوتازہ کرنے والی کتاب لکھی، مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے بارے میں مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب نے کہا کہ'' ان کے ہاتھوں پر فلسفہ نے اسلام قبول کیا''۔مگر امام غزالی نے ہی ''مقاصد الفلاسفہ'' لکھنے کے بعد'' تھافت الفلاسفہ'' لکھی اور فلسفہ کے اثر سے نجات پانے کے بعد اپنے کو''المنقذ من الضلال ''قرار دیا اور''المنقذ من الضلال '' کتاب تصنیف کی۔

ان کے اس موقف پر علامہ ابن رشد جو خود علوم دینیہ اور علوم عقلیہ کے جامع تھے تنقید کی اور''تھافت التھافت '' کتاب''تھافت الفلاسفہ '' کے رد میں لکھی، انہوں نے اس ٹکراؤ سے ان کار کیا اور لکھا ہے کہ دونوں کا میدان الگ ہے، اس لیے ٹکراؤ کا کوئی سوال نہیں، وہ کہتے ہیں کہ ''مذہب کا تعلق مابعدالطبیعیات سے ہے اور فلسفہ کا طبیعیات سے''۔

مولانا عبدالباری صاحب ندوی اپنی معرکہ آراء کتاب ''مذہب وعقلیات'' میں علامہ ابن رشد کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مذہب سے مرادفوق الفطرۃ (سپر نیچرل) ہستی یا چیز کا اعتقاد ہے، جو سارے مذاہب میں پایا جاتا ہے، عقلیات سے مراد سائنس وفلسفہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ساتھ یورپ کی سائنٹفک ایجادات بھی آئی ہیں، جن میں سے ہر ایک ریل تار، الیکٹرسٹی، وغیرہ اچھے اچھوں کی عقل کو حیران بنادینے کے لئے کافی تھی، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ سائنس نے زمین کو تول کر وزن معلوم کرلیا، روشنی کی شرح رفتار بتادی، مریخ، دریا، پہاڑ، اورآبادی کا سراغ لگایا، اب اسکول اور کالجوں میں ہمارے فرزندان تعلیم جدید نے کہیں یہ سن پایا کہ سائنس نے''خدا کو سرحد باہر کردیا'' تو بیچارے سمجھے کہ جو چیز ایسے حیرت انگیز اور سمجھ میں نہ آنے والے معجزے دکھا سکتی ہے، جب اسی نے خدا اور مذہب کو باطل ٹھہرادیا تو پھر اب کیا رہا، اس مرعوبیت کا آج تک یہ عالم ہے کہ نفس یورپ یا سائنس کا نام لے لینا کسی بات کو منوانے کے لیے سب سے مؤثر استدلال ثابت ہوتا ہے۔

غرض برادران اسکول وکالج کو سنجیدگی کے ساتھ "مذہب وعقلیات" کے مطالعہ اور ان کے باہمی تعلق پر کبھی غور وفکر کی فرصت تو میسر نہ ہوئی اور نہ یہ سوچا کہ دونوں ایک میدان میں اتر بھی سکتے ہیں یا نہیں، لیکن عقل وسائنس کی فتح کے نقارچی بن گئے، اگرچہ مصر اور ہندوستان میں یہ وبا زیادہ تر اسی طرح پھیلی تاہم اس کے ذمہ دار ہمارے نئے تعلیم یافتہ احباب کی تنہا مرعوبیت ونادانی نہیں ہے اور اسباب بھی ہیں جنہوں نے اس خیال کو عالم گیر بنادیا۔

ا۔ اولاً تو بعض ذمہ دار اور سائنس کے اکابر رجال مثلاً "لاپلاس" "ٹنڈل ہکسلے" وغیرہ کی زبان وقلم سے ایسے الفاظ نکلے کہ عوام کا تو کیا ذکر خواص تک اس کے دھوکے اور غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ مذہب وسائنس کی دشمنی کا خیال کوئی بازاری گپ نہیں ہے، لاپلاس نے جب اپنی کتاب "Mecanique Cdeiste" نپولین کو پیش کی تو اس نے کہا: لوگ کہتے ہیں کہ تم نے یہ کتاب نظام عالم پر لکھی ہے، اور پھر بھی اس کے خالق کا نام نہیں لیا، اس پر لاپلاس نے خشونت کے ساتھ جواب دیا کہ جناب والا مجھ کو اس قسم کے کسی فرض کی ضرورت نہ تھی (فطرت ولاادریت، از: وارڈ صفحہ اول جلد ۲)

ہکسلے نے یہ کہدیا کہ مادہ اور قوانین مادہ نے عقیدۂ خلق (جینس) اور روح کے وجود کو باطل کردیا، اس طرح کی باتوں نے سائنس کی حقیقت سے ناواقفوں کے دل میں اور بھی مذہب کی نسبت وسوسے پیدا کردئے اور ان کی مرعوبیت کو گویا ایک سند ہاتھ آگئی۔

۲۔ لیکن حقیقت میں غلط فہمی کا سب سے بڑا منشاء اہل سائنس اور علماء مذہب کی عداوت کا مغالطہ ہے، جس کا بہت کچھ ذمہ دار یورپ کا محکمۂ احتساب سائنس (ان کویزیشن) ہے، جس کی قربان گاہ پر قرون وسطیٰ میں پاپاؤں کے ہاتھ بیسیوں محققین سائنس انکشافات علمی کے گناہ میں نذر چڑھ گئے، پادری سمجھتے تھے کہ زمین کا گول کہنا بھی مذہب کی تردید ہے، کوپرنیکس نے حرکت ارض ومرکزیت

شمس کے اثبات یعنی نظام فیساغورس کی تائید میں کتاب لکھی تو اس کا پڑھنا کفر قرار پایا، گلیلو نے دوربین کی ایجاد سے کوپرنیکس کی تائید کی تو اس کو قید کی سزا ملی اور قید ہی میں مر گیا، برونو اس جرم میں جلا دیا گیا کہ "تعدد عوالم" کا قائل تھا۔

غرض اس محکمہ نے سیکڑوں آدمیوں کو مذہب کے نام سے ستایا اور برباد کیا، اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ لوگ علم و مذہب کو حریف سمجھنے لگے، اس مغالطہ نے اتنا تسلط حاصل کیا کہ ڈریپر نے ایک کتاب ہی (معرکۂ مذہب وسائنس) کے نام سے لکھ ڈالی، حالانکہ اس کا ماحصل تمامتر وہی اہل سائنس اور علماء مذہب کا معرکہ ہے۔

۳۔ تیسرا بڑا سبب خود مذہب کے نادان دوست ہمارے متکلمین ہیں، انہوں نے اس پر نہ تو غور کیا کہ مذہب وعقلیات میں اصولاً کوئی تصادم ہے یا نہیں، اور ان دونوں کی تطبیق ومصالحت کی الجھن میں پڑ گئے، یا پھر حکمت وفلسفہ کی زبان سے جو بات بھی نکلی اس کی تردید اپنا فرض منصبی قرار دے لیا۔

مسلمانوں میں جس شے نے عقل ومذہب کی باہمی منافرت کے خیال کو سب سے زیادہ پھیلایا اور راسخ کیا، وہ یہی علم کلام کی زیاں کار ایجاد ہے، جس نے ایک طرف مذہب کو شدید صدمہ پہونچایا اور دوسری طرف ذہنی قوتوں کو باد پیمائی اور سطح آب پر نقش آرائیوں میں رائیگاں کیا گیا۔

غرض علم ومذہب کے باہمی عناد وتصادم کا افسانہ جس قدر دراز اور عالم گیر ہے اس سے بدرجہا زیادہ بے بنیاد وغلط ہے، اس صحبت میں اسی نکتہ کو آپ حضرات کے سامنے واضح کرنا مقصود ہے، نہ کہ دونوں میں تطبیق، جیسا کہ بعض احباب کو مقرر کی مولویت سے بدگمانی ہوئی ہے اور جیسا کہ بالعموم عقل ومذہب کے یکجائی استعمال سے لوگ سمجھ بیٹھتے ہیں، خصوصاً جب کسی مذہبی آدمی کی زبان پر یہ الفاظ آجائیں، آج صبح ہی ایک تعلیم یافتہ دوست فرمانے لگے کہ "مذہب تو دیوالیہ ہو چکا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اس کی حمایت کیونکر کرتے ہو۔

مذہب وسائنس کی بے تعلقی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے پہلے اس کے باہمی فرق اور بُعدِ حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشیں کر لینا چاہئے، ریل کی دو گاڑیاں ٹکرا سکتی ہیں اور ٹکراتی ہیں، لیکن ریل گاڑی اور جہاز میں تصادم ناممکن ہے، اس لئے کہ ریل سمندر میں چل ہی نہیں سکتی ہے اور نہ جہاز خشکی پر، بعینہٖ یہی حال سائنس اور مذہب کا ہے، سائنس کا مذہب کی حد میں داخل ہونا اس سے زیادہ محال ہے، جتنا ریل کا پانی یا جہاز کا خشکی پر چلنا ہے، مذہب جہاں سے شروع ہوتا ہے سائنس کی رسائی وہاں ختم ہو جاتی ہے، سائنس کا جو منتہائے پرواز ہے مذہب کا وہ نقطۂ آغاز ہے، سائنس کی بحث وتحقیق کا تعلق تمام تر فطرت (نیچر) کے واقعات اور تجربات سے ہے، مذہب کی بناء یکسر فوق الفطرت اور تجربہ اور مشاہدہ کی دسترس سے ماوارء چیزوں پر ہے، مثلاً خدا، روح، حشر ونشر وغیرہ۔ (مذہب وعقلیات، از: مولانا عبدالباری ندویؒ، ص: ۱۳-۱۵)

مولانا عبدالباری ندوی نے مذہب وعقلیات میں دونوں کے درمیان اس مفروضہ تضاد کو علمی اور عقلی دلائل سے رد کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ دونوں کا دائرہ الگ ہے، اور ٹکراؤ اسی طرح ناممکن ہے جس طرح ٹرین اور ہوائی جہاز کا ٹکراؤ۔

مولانا عبدالباری صاحب کی دوسری مشہور تصنیف ''مذہب وسائنس'' ہے، اس کے بارے میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

اس آخری دور میں ان کے قلم سے ایک اور مفید تصنیف ''مذہب وسائنس'' نکلی جو ہماری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے شائع کی، اس پر مشہور فاضل ریاضیات ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی کا فاضلانہ مقدمہ ہے، جس میں انہوں نے اس کتاب کو سراہا ہے، اس کتاب میں ان کا قدیم شبلوی اسلوب پھر جاگ اٹھا ہے اور ان کے اشہب قلم کو اپنی بھولی ہوئی راہیں یاد آ گئی ہیں، یہ کتاب ان کے عالم ہوش اور صلاحیت فکر وتحریر کی آخری یادگار ہے۔

(پرانے چراغ: ۲/ ۱۲۶-۱۲۷)

فلسفہ اور سائنس سے متعلق کتابوں کے ساتھ ان کی ایمانیات اور یقینیات سے متعلق کتابیں مثلاً تجدید دین کامل، تجدید تصوف، تجدید تعلیم وتبلیغ، تجدید معاشیات، معجزات انبیاء اور عقلیات جدیدہ، تجدید دین کامل، قرآن کا دو آیاتی نظام صلاح واصلاح وغیرہ ہیں۔

علوم دینیہ اور علوم عقلیہ سے یکساں طور پر واقفیت کے نتیجہ میں ''سیرۃ النبیؐ'' میں معجزات اور فلسفہ جدید کی بحث لکھنے کے لیے مولانا عبدالباری ندویؒ کا انتخاب ہوا اور ان سے درخواست کی گئی کہ اس پر قلم اٹھائیں، اس سلسلہ میں علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:۔

> ہماری جماعت میں بلکہ علماء کی جماعت میں پروفیسر عبدالباری ندوی (معلم فلسفہ جدیدہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دکن) سے بڑھ کر فلسفہ جدید کا کوئی ماہر نہیں، معجزات کی بحث میں ضرورت تھی کہ اس باب میں فلسفہ جدید کی جو موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں ہیں، ان سے بھی تعرض کیا جائے، چنانچہ میری درخواست پر موصوف نے ''معجزات اور فلسفہ جدید'' کا باب لکھ کر عنایت کیا، جو اس کتاب کے ص ۱۰۸ سے شروع ہو کر ص ۱۹۷ پر تمام ہوا۔

(دیباچہ طبع اول، سیرۃ النبی: ۲/۱۷، مکتبہ مدینہ، لاہور، پاکستان، ۲۰۰۶ء)

مولانا عبدالباری ندویؒ عقلیات اور ایمانیات کے علوم کے جامع تھے، علماء دین میں اس عصر میں ان کی نظیر نہیں ملتی، افسوس ہے کہ ان کی ساری تصنیفات اردو میں ہیں، صرف ''مذہب وعقلیات'' اور ''تجدید تصوف'' کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مذہب وعقلیات'' کو اپنی محسن کتابوں میں شمار کیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

> مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ''مذہب وعقلیات'' پر نظر پڑی، جس کو ذوق وذہن نے پورے طور پر اپنا لیا، اس رسالہ سے عقل ونقل کے حدود اور تجربہ وعلم انسانی کی نارسی ونا پائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل

ہوا، جو مطالعہ میں بہت کم آیا، اس کے بعد قدیم وجدید فلسفہ اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا پڑھا، مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا، بلکہ جس قدر پڑھا'' إن هم إلا يخرصون ''اور''كذبوا بما لم يحيطوا بعلمه ولما يأتهم تأويله'' کی تفسیر وتوضیح ہی ہوتی رہی۔ (پرانے چراغ:۲/۱۱۸)

مذہب وعقلیات کے ترجمہ کو پڑھ کر ایک عرب عالم نے جو ایک عرب یونیورسٹی میں شعبۂ عقیدہ کے سربراہ تھے، اس کی افادیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا کہ'' یہ کتاب تو عقیدہ کے نصاب میں داخل ہونے کے لائق ہے''۔ ایک مصری فلسفہ کے عالم جو الحاد کے قریب تھے اس کتاب کے مطالعہ سے دین کے بارے میں ان کے ذہن میں جو شکوک وشبہات تھے ان سے تائب ہوئے اور نادم ہوئے۔

تصنیف وتالیف کے لیے اردو زبان اختیار کرنے کی وجہ سے عالم عربی مولانا عبدالباری صاحب ندوی سے واقف نہیں ہوسکا، ورنہ وہ عالم اسلام کے مفکروں میں شمار ہوتے۔ مولانا عبدالباری ندوی کی کتابیں موضوع اور عصر کے اعتبار سے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کتابوں کو موجودہ عصر کے اسلوب کے اعتبار سے نظر ثانی کر کے شائع کیا جائے، ان کی کتابیں دینی علوم سے اشتغال رکھنے والوں اور عصری علوم سے اشتغال رکھنے والوں کے لیے یکساں مفید ہیں، اور ہر عصر میں رہنمائی کی صلاحیت موجود ہے، اس افادیت اور رہنمائی کو عام کرنے لیے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو ان کی ساری کتابوں کو ایڈٹ کر کے موجودہ دور کے اسلوب میں پیش کرے۔

علامہ عبدالباری ندویؒ
مایہ ناز شخصیت اور عظیم فلسفی

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (۱)

مایہ ناز شخصیت کے عناصر ترکیبی:

علوم نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ انسان علمی، تہذیبی اور عقلی اعتبار سے خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ ہو جائے، مگر وہ اپنے اندر اکثر حالات میں ایک کمی کا احساس رکھتے ہوئے بھی اسے ظاہر کرنا کسی حد تک اپنی توہین سمجھتا ہے، یا اس سے ملتی جلتی ہوئی کسی شعوری کیفیت میں مبتلا رہتا ہے، اس کے باوجود اس کی جستجو اپنی اس کیفیت کو ختم کرنے یا اس کا علاج کرنے کے بارے میں قائم رہتی ہے، اور غالباً یہ ایک فطری تقاضہ ہے، جس کو پورا کرنا شخصیت کی تکمیل کے لئے انتہائی ضروری ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم بہت سے ایسے با اثر اہل علم وقلم کا ذکر کر سکتے ہیں، جو خود اپنی علمی اور ثقافتی شخصیت کے اعتبار سے مشہور تھے، مگر ان کو ہمہ وقت اس بات کا شعور قائم رہا کہ وہ اپنے اندر پائی جانے والی کمی کو دور کرسکیں، اسلامی تاریخ میں بہت سی ایسی شخصیات کا ذکر موجود ہے، جنہوں نے کمال کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہوئے اپنا گوہر مقصود حاصل کرنے کی کوشش کی اور کسی اضافی نسبت یا کمی وزیادتی کی فکر سے بے پرواہ ہو کر انہوں نے اپنے مقصد کی تکمیل کر لی، علمائے سلف میں شاید ہی کوئی ایسا ہو، جس نے اپنے آپ کو انسان

(۱) مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

کامل سمجھ کر دوسرے اپنے ساتھیوں سے استفادہ نہ کیا ہو۔

عالم جلیل اور ماہر عقلیات حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تمام علمی وجاہتوں کے باوجود اپنے آپ کو اس کا اہل تصور کیا کہ وہ معرفت الٰہی میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ربانیت اور معرفت کی دولت حاصل کریں اور آستانۂ تھانوی کا انتخاب اپنے گوہر مقصود کو حاصل کرنے کے لئے دل کی گہرائیوں سے قبول کر کے ایک عالم جلیل اور ماہر علوم وفنون ہونے کے ساتھ مربی ومرشد کی سند لے کر عالم قلب کو معرفت کے نور سے روشن کر سکیں، چنانچہ اس مرحلہ پر فائز ہونے کے بعد کتنی ہی کتابیں اس موضوع پر مختلف عنوانات سے تصنیف کر کے حضرت تھانویؒ کے ذریعہ مقام خلافت پر فائز ہوئے اور اشرفی کتب خانہ کی زینت میں ان کتابوں سے اضافہ ہوا۔

قدیم وجدید کے رمز شناس:

قدیم زمانے سے علوم عقلیہ اور اسلامی تہذیب کے درمیان کشمکش جاری ہے، اس کی وجہ سے دو فریق وجود میں آئے، ایک علوم عقلیہ کا داعی تھا اور دوسرا ان کو سرے سے مسترد کرتا تھا، اور دونوں کے درمیان کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ہمزۂ وصل کا کام دیتی اور اعتدال وتوازن کے ساتھ جمع کرتی، باوجود اس کے کہ صحیح اسلامی زندگی کا تصور اس وقت نہیں کیا جا سکتا، جب تک اس دین کی جامعیت کا اعتراف نہ ہو، جو دینی اور سائنسی علوم کا جامع ہے، دین ودنیا کی اس کشمکش سے بعض ذہنوں میں یہ شکوک وشبہات در آئے تھے کہ دین ودنیا کا اجتماع نہیں ہو سکتا، اور دین میں اس کا کوئی تصور بھی نہیں ہے، چنانچہ مادہ پرستوں نے اس جامعیت کے نظریہ کو مسترد کیا اور اس کو انسانی معاشرہ کے لئے ناسور بتایا۔

علامہ عبدالباری ندویؒ: ایک تعارف

علامہ عبدالباری ندویؒ ندوۃ العلماء کے فارغ ہونے والے پہلے بیچ میں ممتاز مقام کے حامل تھے، وہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے رفیق درس اور علامہ شبلیؒ کے ہونہار شاگرد تھے،

علامہ عبدالباری ندویؒ دونوں ثقافتوں کے جامع تھے، وہ جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر بھی رہے، اور شعبہ فلسفہ کے صدر بھی مقرر ہوئے، اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں ہیں، جن میں "مذہب وسائنس" موضوع کی جدت اور اسلوب کی لطافت کی وجہ سے ممتاز ہے، انہوں نے تجدید دین ومعاشرت وسلوک کے نام سے کئی کتابیں تصنیف کی، ان کی کتاب مذہب وسائنس مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء سے شائع ہوچکی ہے۔

علامہ عبدالباری ندویؒ نے فلسفہ کو مسلمان بنانے اور اسلامی کتب خانہ کو علمی کارناموں سے معمور کرنے میں زبردست حصہ لیا، وہ مذہب وسائنس، روح وجسم، اصل ونقل کی جامعیت کے نہ صرف یہ کہ قائل تھے، بلکہ داعی بھی تھے، جبکہ دوسرے فلاسفہ انحراف والحاد کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، اور وہ مذہب وسائنس میں دوئی کے نظریہ کے حامی تھے، ایسے ماحول میں علامہ عبدالباریؒ نے طاقتور دلائل سے ثابت کیا کہ اسلامی زندگی کا فلسفہ یونان وروم کی طرح کوئی پہیلی نہیں؛ بلکہ زندگی کی ضرورت اور وقت کی پکار ہے، جس سے کسی طرح بھی اغماض نہیں برتا جاسکتا اور اس کی زمانی اور مکانی قیمت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اسرار شریعت کے ماہرین سے مولانا عبدالباری ندویؒ کا استفادہ

تاریخ شاہد ہے کہ شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اسرار شریعت کے فلسفہ پر بارہویں صدی ہجری میں "حجۃ اللہ البالغۃ" کے نام سے ایک معرکۃ الآراء کتاب لکھی ہے، ان کا قیام دہلی میں رہا، وہاں انہوں نے ایک مدرسہ قائم کیا، جس سے اسلامی فلسفہ کے نمائندگان اور ماہرین نکلے، اور قانون اسلامی کے ماہرین کی ایک بڑی جماعت فارغ ہوکر نکلی، اسی طرح امام غزالیؒ نے بھی سنجیدہ اور مثبت انداز میں لادینی فلسفہ کا ابطال اور اسلامی فلسفہ کا احیاء کیا اور اپنی مایہ ناز کتاب "تہافت الفلاسفۃ" لکھی اور یہ ثابت کیا کہ اسلامی قانون عقل انسانی کے بالکل مطابق ہے، ان کی کتاب "احیاء علوم الدین" اس سلسلہ کی اہم کتاب شمار کی جاتی ہے۔

بلاشبہ علامہ عبدالباری ندویؒ نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم سے استفادہ

کیا، اور دین وعقل کے جامعیت کے تصور سے بھی کسب فیض کیا، اسی طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصنیفات سے بھی استفادہ کیا، اور ان کو اپنی کتابوں کا موضوع بنایا، اور تجدید کے نام سے کئی سلسلے تصنیف کئے۔

تجدید دین کامل: ایک جامع کتاب

ان میں اہم ترین کتاب ''تجدید دین کامل'' ہے، جو حکیم الأمت حضرت تھانویؒ کی تعلیمات وافادات پر مشتمل ہے اور اس میں عقیدہ وعبادت، اجتماع واخلاق میں مسلم معاشرے کے افراد کی کوتاہیوں کا ذکر ہے اور ان کا علاج دین وشریعت کی روشنی میں تجویز کیا گیا ہے، حکیم الامت نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی وصیتوں کو بطور علاج ذکر فرمایا ہے جو درج ذیل ہیں:۔

طالب حق پر لازم ہے کہ اول مسائل ضرور یہ عقائد اہل سنت وجماعت حاصل کرے، پھر ان رذائل سے تزکیہ کرے: حرص، طمع، غضب، جھوٹ، غیبت، بخل، حسد، ریا، کبر وکینہ۔

اور یہ اخلاق پیدا کرے: صبر، شکر، قناعت، علم، یقین، تفویض، توکل، رضا، تسلیم، اور شرع کا پابند رہے، اگر گناہ ہو جائے نیک عمل سے جلد تدراک کرے، نماز باجماعت وقت پر پڑھے، کسی وقت یاد الٰہی سے غافل نہ ہو، لذت ذکر پر شکر بجالائے، کشف وکرامات کا طالب نہ ہو، اپنا حال یا سخن تصوف غیر محرم سے نہ کہے، دنیا ومافیہا کو دل سے ترک کرے، خلاف شرع فقراء کی صحبت سے بچے۔

لوگوں سے بقدر ضرورت اخلاق سے ملے، اپنے کو سب سے کمتر جانے، کسی پر اعتراض نہ کرے، بات نرمی سے کرے، سکوت وخلوت کو محبوب رکھے، اوقات منضبط رکھے، تشویش کو دل میں نہ آنے دے، جو کچھ پیش آئے، حق کی طرف سے سمجھے، غیر اللہ کا خطرہ نہ آنے دے، دینی کاموں میں نفع پہنچاتا رہے، نیت خالص رکھے، خورد ونوش میں اعتدال رکھے، نہ اتنا زیادہ کھائے کہ

کسل ہو، نہ اتنا کم کہ عبادت سے ضعف ہو، کسب حلال افضل ہے، اگر توکل کرے تو بھی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ طمع نہ رکھے، نہ کسی سے امید وخوف کرے، حق تعالیٰ کی طلب میں بے چین رہے۔

نعمت پر شکر کرے، فقر وفاقہ سے تنگ دل نہ ہو، اپنے متعلقین سے نرمی برتے، ان کے خطا وقصور سے درگذر کرے، ان کا عذر قبول کرے، کسی کی غیبت وعیب نہ کرے، اپنے عیوب کو پیش نظر رکھے، کسی سے تکرار نہ کرے، مہمان نواز ومسافر پرور رہے، غرباء ومساکین، علماء وصلحاء کی صحبت اختیار کرے، قناعت وایثار کی عادت رکھے، بھوک وپیاس کو محبوب رکھے، ہنسے کم، روئے زیادہ، عذاب الٰہی سے لرزاں رہے۔

موت کا ہر وقت خیال رکھے، روزانہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرلیا کرے، نیکی پر شکر، بدی پر توبہ کرے، صدق مقال واکل حلال اپنا شعار رکھے، غیر مشروع مجلس میں نہ جائے، رسوم جہل سے بچے، شرمگیں، کم گو، کم رنج، صلاح جو، نیکوکار، رفتار باوقار، بردبار رہے، ان صفات پر مغرور نہ ہو۔

(تجدید معاشرت ص:۳۴۹-۳۵۱)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا تأثر مذکورہ کتاب کے بارے میں

علامہ عبدالباری ندویؒ کی ایک اہم کتاب تجدید دین کامل ہے، اس کا پہلا نام "جامع المجدد دین" تھا، بعد میں اس کا نام "تجدید دین کامل" پڑا، یہ کتاب علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مقدمہ سے مزین ہوکر منظر عام پر آئی ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ اس کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

اس میں مؤلف نے حضرت والا کی ان تجدیدی واصلاحی کوششوں کو جوامت مرحومہ کی ہر نوع وہر صنف کے لئے مفید ہیں، پورے استقصاء کے ساتھ جمع کردیا ہے، ان کو پڑھ کر خاص وعام ہر شخص حضرت کے ان اصلاحی کارناموں کو تجدیدی رنگ میں پاکر ان کے مجدد وقت ہونے کے قوی سے قوی

تر احتمال کے ماننے پر مجبور ہوگا، اور یہ بھی اللہ تعالی کا ایک فضل ہے کہ حضرت والا کے ان تجدیدی کارناموں پر ایک فاضل ولائق شخص نے ظن وتخمین کو قوی کرنے کے لیے شواہد ودلائل بھی یکجا کردئے ہیں اور یہ ایک ایسی زبردست چیز ہے کہ جو کسی زمانہ میں کسی اور کو حاصل نہیں ہوئی۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کسی کو یہ شبہ نہ گذرے کہ اس تحریر یا تالیف کا مدعا کسی شخص کی مجددیت کے دعوی کی تشہیر یا منصب تجدید کی دعوت وتلقین ہے، بلکہ یہ مؤلف کی عقیدت مندانہ تعبیر ہے کہ وہ حضرت کی اصلاحی مساعی کو تجدیدات کے نام سے یاد کرتے ہیں'' (مقدمہ کتاب:۲۸)

مفکر اسلام کے تأثرات علامہ عبدالباری ندوی کے بارے میں:

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ علامہ عبدالباری ندویؒ کے بارے میں اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

مولانا تھانویؒ کے رنگ کا مولانا عبدالباری صاحب پر ایسا غلبہ ہوا کہ مولانا (جن کی طبیعت میں ہمیشہ سے کسی چیز کو پورے طور پر قبول کرنے اور ماسوا کے نفی کی صلاحیت تھی) کے علمی خیالات اور طرز تحریر تک پر اثر پڑا، وہ دبستان شبلی کے ایک کامیاب وممتاز ادیب وصاحب قلم تھے، تحریر میں پختگی وشگفتگی، استدلال وعقلیت کا رکھ رکھاؤ اور زبان وادب کی چاشنی، جملوں کی برجستگی، دونوں پہلو بہ پہلو ہوتے اور یہی مولانا کی تربیت کا فیض تھا، ان کا رسالہ ''مذہب وعقلیات'' اور ان کا مضمون ''معجزات'' پر جو سیرت النبیؐ کے پانچویں حصہ میں شامل ہے، اس کا نمونہ ہے، لیکن اب ان کو اپنے اس قدیم طرز تحریر میں تلبیس یا تدلیس کا (اور یہ الفاظ خود انہی کے ہیں) شبہ ہونے لگا اور انہوں نے مولانا تھانوی کے طرز کی تقلید شروع کردی، اگر ''چھوٹا منھ بڑی بات'' نہ سمجھی جائے تو بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ اس میں محبت کو دخل زیادہ تھا، عقل وزمانہ کے تقاضوں

کی رعایت کو کم، اگر وہ ان حقائق کو بھی جوان کو مولانا تھانوی کی صحبت یا ان کی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوئے تھے، دبستان شبلی ہی کی زبان میں ادا کرتے تو اس جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے جس کے لئے وہ کتابیں لکھتے تھے، زیادہ مفید ہوتا اور نوجوانوں کا وہ طبقہ اور ملک کا دانشور حلقہ حقیقت دین سے زیادہ آشنا اور قریب ہوتا۔

ان کے اس دور کی تصنیفات ''جامع المجددین ''اور سلسلۂ تجدید کی کتابیں ہیں، جو ہندوستان اور پاکستان میں مقبول ہوئیں، تجدید وتصوف وسلوک کا ترجمہ کسی قدر اختصار کے ساتھ عربی میں بھی ہوا، یہ خدمت میرے بھانجے مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی نے انجام دی، میں نے اس پر مقدمہ لکھا جو کئی جگہ نقل ہوا، پھر میں نے اسی کو اپنی کتاب ''ربانیۃ لا رھبانیۃ'' کا مقدمہ بنایا، عربی ترجمہ دمشق سے شائع ہوا اور اس سے ترکی میں ترجمہ کیا گیا، مولانا نے دونوں ترجموں کو اپنی زندگی میں دیکھ لیا اور اپنی آواز کو بلاد عرب اور ترکی میں سن کر بہت خوش ہوئے۔

تجدید تصوف وسلوک

علامہ عبدالباری ندوی کی ایک کتاب تجدید تصوف وسلوک ہے وہ خود اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

تصوف سے متعلق ہر قسم کی علمی وعملی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کر کے بتلایا گیا ہے کہ حقیقی تصوف دراصل کمال اسلام اور کمال ایمان کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اور بے صوفی بنے اسلام کی دنیوی واخروی، انفرادی اور اجتماعی برکات وثمرات کا حاصل ہونا عملاً ناممکن ہے۔

حضرت مولانا عبداللہ عباس ندویؒ اس کتاب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

مولانا نے اس کتاب میں تصوف کی حقیقت یہ بتائی ہے کہ ''یہ فقہ باطن ہے''، جو فقہ ظاہر سے زیادہ اہمیت کا مستحق ہے، اذکار واشغال کی کیا حقیقت

ہے، مجاہدات کا کیا مطلب ہے، بیعت وارادت کیوں اور کس حد تک اور کس منزل پر ضروری ہے، عشق ومحبت کا دعویٰ بغیر عمل صالح کے لغو ہے، امانت کا اصل مفہوم کیا ہے؟ غرض اس کتاب میں اصولی باتیں ہیں، جن کو ملفوظات اور مکاتیب تھانوی سے استفادہ کر کے مرتب کیا گیا ہے، تقریباً ۵۰۰/صفحات پر یہ کتاب پہلی مرتبہ چھپی تھی۔ (کتاب کا تعارف (جدید اڈیشن)

علامہ عبدالباری ندویؒ پر ایک جامع کتاب

علامہ عبدالباری ندویؒ ندوۃ العلماء کی نمائندہ شخصیت تھے، ندوۃ العلماء کے ممتاز علماء علامہ حکیم سید عبدالحی حسنیؒ (والد بزرگوار حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ) علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانیؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ وغیرہ سے ان کے اچھے مراسم تھے، علامہ عبدالباری ندویؒ کی شخصیت پر مولانا محمود حسن حسنی ندوی نے ''حیات عبدالباری'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے، اور مجلس صحافت ونشریات لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے مقدمہ سے مزین ہے، یہ ایک مبارک کوشش ہے، جس میں علامہ عبدالباری ندویؒ کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ
اور مولانا عبدالباری ندویؒ کے باہمی مراسم

پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی(۱)

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۱۸۶۷۔۱۹۵۰ء) ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک ریاستِ حیدرآباد میں صدر الصدور امور مذہبی رہے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ قایم ہوئی۔ آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد نے انھیں جامعہ کا پہلا وائس چانسلر مقرر کیا۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی (م ۱۹۸۰ء) نے اپنے مضمون ''چار منظر'' (مطبوعہ دوروزہ جمہور، علی گڑھ، صدر یار جنگ نمبر ۱۹۵۱ء) میں اس موقع کی بہت اچھی منظر کشی کی ہے جب مولانا شروانی جامعہ عثمانیہ کا افتتاح کرنے کے لیے تشریف لائے۔ موقع کی اہمیت، حیدر آباد کے عمائد کا مجمع، مولانا شروانی کی جامہ زیب اور با وقار شخصیت۔ پروفیسر شروانی نے لکھا ہے کہ عجیب دل فریب اور متاثر کن سماں تھا۔ جامعہ چارٹر مولانا شروانی ہی نے پڑھ کر سنایا تھا۔

چوں کہ وہ جامعہ عثمانیہ کے پہلے وائس چانسلر تھے، اس لیے انھیں موقع ملا کہ جامعہ کے مختلف شعبوں میں اپنی پسند کے لایق اساتذہ کو جمع کر دیں۔ نظام حیدرآباد ان کا بہت لحاظ رکھتے تھے اور ان کی رائے کو بہت وقعت دیتے تھے۔ انھوں نے اساتذہ کے انتخاب میں اسناد اور ڈگریوں سے زیادہ علم وفضل کو اہمیت دی۔ شعبۂ دینیات میں مفتی عبداللطیف اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا تقرر فرمایا، شعبۂ فلسفہ میں مولانا عبدالباری ندوی اور ڈاکٹر

(۱) جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، ومدیر کانفرنس گزٹ۔

خلیفہ عبدالحکیم کا اور فارسی میں مولوی عبدالمجید خاں کا۔ خیر دینیات اور فارسی میں تو بغیر ڈگری کے کام چل گیا، لیکن فلسفہ کا معاملہ مختلف تھا اور اس شعبہ میں اگر چہ تقرر ایک ڈاکٹر کا بھی کیا تھا، لیکن صدرِ شعبہ کی حیثیت سے سفارش ایک عالمِ دین کی کی تھی۔ کسی بارسوخ شخص نے نظام حیدر آباد کو اس طرف توجہ دلائی اور انھوں نے مولانا شروانی سے جواب طلب کیا۔ مولانا شروانی مولانا عبدالباری کی قابلیت سے بخوبی واقف تھے اور انھیں اپنے انتخاب کی صحت پر پورا اعتماد تھا۔ جب مولانا عبدالباری گجرات کالج، احمد آباد میں استاد تھے، وہاں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہونا طے ہوا۔ اس زمانہ میں مولانا شروانی کانفرنس کے سکریٹری تھے۔ انھوں نے مولانا عبدالباری کو لکھا کہ اجلاس میں اپنی پسند کے کسی موضوع پر تقریر کریں۔ مولانا عبدالباری کا بیان ہے کہ وہ عام جلسوں میں تقریر کرنے کے عادی نہیں تھے، اس لیے ایک خاص اور محدود مجمع میں ایک گھنٹہ اپنے حسبِ دل خواہ موضوع (مذہب اور عقلیات) پر اظہارِ خیال کیا جسے بہت پسند کیا گیا۔ صدرِ اجلاس مسٹر ابراہیم رحمت اللہ وزیر تعلیم بمبئی تھے۔ ان کا اور مولانا شروانی کا اصرار ہوا کہ اس موضوع پر کتاب لکھ دیں تو وہ شایع کر دی جائے۔ چنانچہ مولانا عبدالباری نے ''مذہب وعقلیات'' کے نام سے کتاب لکھ دی اور وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ سے شایع ہوگئی۔

جب مولانا شروانی کے پاس نظام کی طرف سے مولانا عبدالباری ندوی کے تقرر کے بارے میں استفسار آیا تو انھوں نے نظام کو لکھا کہ ان کے ہاتھ پر فلسفہ نے اسلام قبول کیا ہے اور ساتھ میں ان کی تصنیف ''مذہب وعقلیات'' بھیج دی۔ نظام مطمئن ہو گئے اور مولانا عبدالباری ندوی کے استقلالِ ملازمت کے کاغذ پر دستخط کر دیے۔

مولانا شروانی نے ان کے سپرد ایک اور علمی خدمت بھی کی کہ جدید علمِ کلام پر ایک مستقل کتاب تصنیف کر دیں۔ اس کے لیے دوسو روپیے ماہوار جداگانہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔ مولانا عبدالباری کی روایت ہے کہ وہ اپنی ناسازگیِ طبع کے باعث یہ خدمت انجام نہ دے سکے اور اس غرض سے انھیں چھ ماہ تک جو رقم موصول ہوتی رہی وہ ملازمت سے سبک دوش ہونے سے

قبل رجسٹرار یونیورسٹی کو واپس کردی۔ یہ ان کا احساس فرض اور دیانت تھی۔

خاکسار راقم الحروف کے پاس مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے خطوط خاصی بڑی تعداد میں محفوظ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدر آباد میں مولانا عبدالباری اور مولانا مناظر احسن گیلانی میں بہت قرب رہا تھا۔ مولانا عبدالباری نے لکھا ہے کہ ہم دونوں شروانی صاحب کی خدمت میں ساتھ ساتھ حاضر ہوتے تھے۔ دونوں کے خطوط میں ایک دوسرے کا بہت ذکر ہے۔ مولانا گیلانی مولانا عبدالباری کا ذکر لفظ ''عباری'' سے کرتے ہیں اور مولانا عبدالباری انھیں ''آپ کے مولوی'' لکھتے ہیں اور یہ ذکر بالعموم دل چسپ اور پر لطف پیرایہ میں ہوتا ہے۔ مثلاً مولانا عبدالباری نے ایک خط میں لکھا ہے کہ اس مرتبہ مولوی صاحب سیدانی صاحبہ کو بھی ساتھ لے آئے ہیں اور اپنے سر پر بوجھ لے لیا ہے۔

مولانا عبدالباری کے خطوط میں بعض علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں پر بھی اظہار خیال ہوا ہے اور سیاسی مسائل پر بھی۔ وہ اپنے خطوط میں کبھی ہجری تاریخ لکھتے ہیں اور کبھی عیسوی۔ ۳۰؍جنوری ۱۹۳۵ء کے خط میں تحریر کیا ہے: ''مسلسل چار سال کی غیر حاضری کے بعد گزشتہ ہفتہ دارالمصنفین میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ الحمد للہ کہ ''با بادہ فروشاں است کہ بود''۔ اس کے بعد پورا خط مولوی مسعود علی ندوی کے ذکر سے مملو ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ ان کے مشاہرے میں اضافہ ہونا چاہیے، کیونکہ ان کا موجودہ مشاہرہ ان کی ضروریات کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ یہ ذکر بعض اور خطوط میں بھی آیا ہے۔ بالآخر ۵؍اگست ۱۹۳۹ء کے خط میں بہت خوش ہو کر لکھا ہے:۔

> جی ہاں، الحمد للہ کہ سید صاحب (مولانا سید سلیمان ندوی) نے خود ہی کچھ سوچ کر (یا) آپ کی تحریک کو بنیاد بنا کر اس کی تکمیل کی تجویز فرمائی۔ بہت اچھا ہوا۔ ثم الحمد للہ۔

دارالمصنفین کا ذکر اور بھی کئی خطوط میں ہے۔ ایک خط میں لکھا ہے:۔

معلوم ہوا کہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے دارالمصنفین میں کچھ تعمیرات کرائی ہیں اور اس اطلاع پر اظہارِ مسرت کیا ہے۔

۴ر شعبان ۱۳۵۴ھ کے خط میں تحریر ہے:۔

دیوبند کا فتنہ ندوہ سے بھی اشد ہے۔ معلوم نہیں اس ''شوریٰ'' میں آپ شرکت فرماسکے یا نہیں۔ مولانا تھانوی کے اچانک استعفیٰ کے سوا کچھ پتہ نہیں کہ التوا کی کیا صورت پیش آئی۔ آپ کے ''مولوی'' بھی جاتے جاتے رہ گئے۔

بیشتر خطوط میں عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کے معاملات زیرِ بحث آئے ہیں۔ کہیں کہیں بعض سیاسی امور پر کسی قدر اظہارِ خیال کیا ہے۔ مثلاً ایک خط میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے لیے لیگ اور کانگریس میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یکم جون ر ۱۹۳۸ء کے خط میں مذکور ہے: اس درمیان میں '' کانگریس سرکار'' کے عجیب تجربات ہوتے رہے۔ صحابہ کے تقیہ (کذا) سنی شیعہ فسادات اور سب سے بڑھ کر اس ''ریڈ'' (Raid) کی بدولت کل جو کچھ دیکھا وہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا جی چاہتا ہے۔

ان خطوط میں مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی کا اکثر ذکر آیا ہے۔ کہیں ان کے نام کے ساتھ اور کہیں صرف ''ہمارے داکٹر صاحب'' کہہ کر۔

افسوس کہ خاکسار راقم الحروف کو مولانا عبد الباری ندوی کی کبھی زیارت نہیں ہوئی۔ انھیں نہ کبھی حبیب گنج میں دیکھا اور نہ حبیب منزل میں۔ ممکن ہے کہ وہ ایسے وقت میں تشریف لائے ہوں جب میں وہاں موجود نہ رہا ہوں۔ ورنہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے اور ان کے مراسم کے بارے میں کچھ اور عرض کرسکتا۔

فلسفۂ جدید کا نکتہ داں عبقری شخصیت

مولانا عبدالباری ندویؒ

مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی(۱)

مولانا عبدالباری ندویؒ اپنے دور کے ذہین اور عبقری شخصیت تھے، بات کی تہہ تک پہنچنے اور کام کی چیز اخذ کرنے کی ان میں غیر معمولی صلاحیت تھی، یہی وجہ ہے کہ علمی دنیا میں انہوں نے اپنی انفرادیت منوالی، فلسفۂ جدید اور طبیعیات سے انہیں دلچسپی تھی، مگر ان کا علم ومطالعہ تقلیدی نہیں تھا، بلکہ اس میں بھی انہوں نے ناقدانہ نظر اور ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' کے اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، ان کے اسی امتیاز وخصوصیت کی وجہ سے فلسفہ بقول مولانا شیروانیؒ ''ان کے ہاتھ پر ایمان لے آیا تھا''۔

مولانا عبدالباری ندویؒ جب جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ فلسفہ کی کرسئ صدارت کو رونق بخشی تو خود یہ فرماتے ہیں کہ:۔

> فلسفہ کے طلباء ایمانیات تک سے دور جا پڑے تھے، مگر الحمد للہ جب میں نے کلاس لینی شروع کی تو نہ صرف مسلمان؛ بلکہ غیر مسلم طلباء میں بھی اسلام کے بنیادی اصولوں پر گہرا یقین پیدا ہو گیا تھا۔

دوسرا واقعہ خود ان کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں کہ۔

> میں نے فلسفۂ جدید کو قرآن مجید کی روشنی میں پڑھانے کا جب اپنا ارادہ ظاہر کیا تو اس وقت کے جامعہ عثمانیہ کے چانسلر سر اکبر حیدری نے (جو ریاست

---

(۱) استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

حیدر آباد کے اس وقت وزیر اعظم تھے) اس شرط پر منظور کیا کہ میں اس سلسلہ
میں ڈاکٹر اقبال کو مطمئن کر کے ان کا تصدیقی خط لاؤں، یونیورسٹی نے اپنے
مصارف خاص پر اس مقصد کے لئے ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں لاہور بھیجا،
میں نے جب اقبال مرحوم کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تو وہ بہت متاثر اور
مطمئن ہوئے اور انہوں نے تصدیقی خط میں لکھا کہ ''یہ شخص قرآن مجید کی روشنی
میں فلسفۂ جدید کی تعلیم بخوبی دے سکتا ہے۔

مولانا نے اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا، یونیورسٹی کے اہم ذمہ داران کے سوا طلباء میں اس فن کے حوالے سے بڑا وقار اور عزت وکرامت حاصل تھی، فلسفۂ جدید یعنی سائنس کو انہوں نے اس تناظر میں پیش کیا کہ سائنس جو مذہب مخالف تصور کی جاتی تھی اسے انہوں نے اس دور میں مذہب کا مؤید ثابت کر دیا۔

مشہور عالم ومحدث مولانا محمد یوسف بنوری نے مولانا موصوف کی رحلت پر جس محبت وجوش سے بھرے ہوئے جذبات کے ساتھ خراج تحسین پیش کیا ہے وہ قابل ذکر ہے۔
فرماتے ہیں:

جدید فلسفہ اور جدید الٰہیات پر ان کی نظر اور ہمہ گیری حیرت انگیز تھی، ان
کے افکار کو جس جستجو اور عرق ریزی سے یکجا کر کے ان سے استنباط کرتے تھے
ان میں ان کا حصہ تھا، سائنس اور مذہب جیسی نافع وعظیم تصنیف سے تمام
فلاسفہ اور ملاحدہ کے سر پر جوتے لگائے اور حجت پوری کر دی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبی کی تالیف میں معجزات انبیاء کی بحث کا آغاز کیا تو انہیں یہ احساس ہوا کہ عصر جدید کے نامور فلسفیوں اور عقلیات جدیدہ کے ماہرین نے علت ومعلول کے ربط کو اس درجہ محکم قرار دیا ہے کہ اس کے خلاف ہونا ناممکن ہے، اور اس کا سہارا لے کر یورپ کے دانشوروں اور ان کے متبعین کی شیرہ چشم جماعت معجزات انبیاء کا اس لئے انکار کیا ہے کہ وہ علت ومعلول کے باہمی ربط کے برخلاف خرق عادت ہے، اور یہ محال

ہے، یہاں تک کہ ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد طبع ہو کر جب آئی تو سر سید احمد خاں نے اس کتاب پر جس تاثر کا اظہار کیا اور آئندہ کے عزائم کا برملا ذکر کیا، وہ ان کے الفاظ میں سماعت فرمائیں۔

> ولیم میور نے جو کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حال میں لکھی ہے وہ میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی ناانصافیاں اور تعصّبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جائے گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا تھا حاضر کرو۔ (ص ۲۰۱، فکر و نظر سیرت نمبر)

مصنف نے اپنے مدمقابل ولیم میور کے بارے میں کسی مرحلے پر مناظرانہ اور معاندانہ یا طنز آمیز لب ولہجہ اختیار نہیں کیا ہے، الخطبات الأحمدیہ ایک دیباچہ اور ۱۲ ر خطبات پر مشتمل ہے، خطبے کی حیثیت ایک باب کی ہے، اس کتاب میں سر سید احمد خاں مرحوم نے معجزات و خرق عادت واقعات کے ذیل میں مغربی مصنفین سے مرعوب اور فلسفۂ جدید سے مبہوت نظر آتے ہیں، چنانچہ مستشرقین نے جسمانی معراج پر اعتراض کیا، سر سید احمد خان بجائے اس کے کہ دلائل سے یہ بات ثابت کرتے کہ ایسا ہونا ممکن ہے، وہ سرے سے ان روایات ہی کا انکار کر بیٹھے جن سے اس واقعہ کا ثبوت ملتا ہے، حالانکہ اب سائنسی تحقیقات اس منزل پر پہنچ گئی کہ خود وہ طبقہ جو کل تک بہت سی ایسی باتوں کا انکار کرتا تھا جو پیغمبر اسلام کے حوالہ سے کہی جاتی تھیں، اب ان کا معترف نظر آتا ہے۔

معجزہ تو حقیقت میں معرفت نبوت کا ایک ذریعہ ہے، اسے عقل کی ترازو میں کیسے تولا جا سکتا ہے، نبوت و رسالت کی حدیں تو شروع ہی وہاں سے ہوتی ہیں، جہاں انسانی عقل کی رسائی ختم ہو جاتی ہے، اور اس کے حواس ادراک و شعور سے عاجز و درماندہ ہو جاتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نبوت ورسالت سے پہلے شق صدر کا واقعہ پیش آیا، سر سید احمد خان اس کا انکار کرتے ہیں، اور شق صدر کو شرح صدر سے تعبیر کرتے ہیں، جب کہ محدثین، مسلم، ابوداؤد، طیالسی، احمد بن حنبل، طبرانی، زرقانی، بیہقی، عسقلانی، ابن سعد، ابن ہشام اور سیوطی نے اس کا تذکرہ کیا ہے، اس کے بعد سر سید احمد خاں کا یہ کہنا کہ "یہ سب روایات ناقابل اعتبار اور بے ہودہ افسانے ہیں، نہ صرف یہ کہ بے بنیاد اور بے دلیل بات ہے بلکہ غیر شائستہ انداز ہے، حقیقت یہ ہے کہ ولیم میور اور مستشرقین کے مقابلے میں ان کا رویہ معذرت خواہانہ ہے۔ (فکر ونظر سیرت نمبر ص:۲۸۱)

اس کے برعکس سیرۃ النبی کے موضوع پر ایک جامع اور ضخیم کتاب لکھنے کا احساس علامہ شبلی کو اس وقت ہوا جب ۱۹۰۵ھ میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ نے سیرت پر ایک کتاب لکھی، کتاب بلاشبہ محنت سے لکھی، اور اکثر حوالے کتب احادیث سے دئے، لیکن اس کے باوجود کتاب اپنی محتویات کے ساتھ بڑی زہرناک تحقیق تھی۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے جنوری ۱۹۱۲ء میں سیرۃ النبی کی تالیف کے عزم کا اعلان کردیا، جس میں سیرت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے، خصوصاً تیسری جلد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت، حقیقت نبوت، دلائل نبوت پر مشتمل ہے، اور معجزات کی بحث میں عقلیات جدیدہ کے ماہرین کے رایوں اور ان کے نگارشات قلم کا استقصاء کیا گیا ہے، اور پھر ان کو انہی کے ہتھیاروں سے ڈھیر بھی کیا گیا ہے، اس باب میں ضرورت تھی ایک ایسے فرد کی جو علوم اسلامیہ کا ماہر ہو، اور بحر مواج کا ماہر شناور بھی ہو، اور علوم جدیدہ کے خوان کا زلہ ربا بھی، اس کے لئے حضرت سید سلیمان ندویؒ کی نظر عبدالباری ندویؒ پر پڑی، اور انہوں نے اس بات کو اتم اور اکمل شکل میں اپنے نگارشات قلم سے سجایا اور سنوارا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان کے اس کام کو ان الفاظ میں سراہا ہے:۔

ہماری جماعت میں بلکہ علماء کی جماعت میں پروفیسر عبدالباری ندوی سے بڑھ کر فلسفہ جدید کا کوئی ماہر نہیں، معجزات کی بحث میں ضرورت تھی کہ اس

باب میں فلسفہ جدید کی جو موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں ہیں، ان سے بھی تعرض کیا جائے، چنانچہ میری درخواست پر موصوف نے ''معجزات اور فلسفہ جدید'' کا باب لکھ کر عنایت کیا۔

مولانا نے پانچ مباحث پر کتاب کو تقسیم کیا ہے، جو مندرجہ ذیل ہے

ا۔امکان معجزات۔۲۔شہادت معجزات۔۳۔استبعاد معجزات۔۴۔یقین معجزات۔ ۵،غایت معجزات۔

ان مباحث پر بحث کرنے کے بعد ان کا خلاصہ بھی موصوف نے یوں پیش کیا ہے:

ا۔معجزہ نام ہے پیمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے جامع انسان کے تعلق سے کسی واقعہ کے ظہور کا، جس کی کم از کم بوقت ظہور عام علل واسباب سے توجیہ نہ ہو سکے۔

۲۔ایسے واقعات بذات خود عقلاً ناممکن نہیں، ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ انتہائی حیرت انگیز یا مستبعد واقعات کی ہوتی ہے، اس لیے بظاہر ان کو قبول کرنے کے لیے بھی نہایت غیر معمولی شہادت کی ضرورت نظر آتی ہے۔

۳۔لیکن دراصل یہ استبعاد ایسا نہیں ہوتا جس کی کافی مثالیں عام زندگی میں بھی نہ ملتی ہوں، اور جن کے قبول کرنے کے لیے کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔

۴۔مگر یقین صرف شہادت وغیرہ خارجی چیزوں سے نہیں پیدا ہوتا، بلکہ اس کا دارومدار زیادہ تر یقین کی خواہش اور اس کے موانع و موئیدات پر ہے جس کا تعلق بڑی حد تک خود یقین کرنے والے گزشتہ معتقدات و مزعومات سے ہوتا ہے۔

۵۔یقین معجزات کی خواہش کا پیدا ہونا موقوف ہے ایمان بالغیب پر۔

۶۔اگر غیب پر ایمان ہے اور فرعون وابوجہل کی طرح عناد وتعصب کے موانع موجود نہیں ہیں، ساتھ ہی مدعی نبوت کی زندگی اپنے احوال واخلاق کے لحاظ سے بجائے خود اس کی نبوت کی موئید ہے تو معجزہ ''یعنی خرق عادت'' کا کیا ذکر ہے خود پیمبر کی آواز وصورت ہی معجزہ ہے۔

مولانا عبدالباری ندویؒ نے اس باب کو جو سیرت النبی کا ایک شاہکار حصہ ہے

معجزات کا عقلی طور پر اثبات کیا ہے اور اس کے استبعاد کی شعوری گتھیوں کو سلجھایا ہے۔

ہیوم کے فلسفہ کی بخیہ ادھیڑتے ہوئے ایک جگہ واشگاف انداز میں یہ کہا ہے کہ

''حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنی جان کے دشمن اور اپنے سب سے بڑے منکر فرعون کے گھر میں پرورش پائی، ہیوم سے بڑھ کر معجزہ کا کون دشمن ہوگا، لیکن اس ان کار کو جب اس کے پورے فلسفہ کی روشنی میں دیکھو تو نظر آتا ہے کہ قبول معجزات کی راہ میں عقل کی خود فریبی کا جو سب سے زبردست طلسم حائل تھا، اس کو ہیوم ہی نے توڑا، اور ہمیشہ کے لیے برباد کر دیا، اس کے بعد راستہ کے صرف چند کانٹوں کا ہٹانا باقی رہ جاتا ہے، چراغ تلے اندھیرا، آدمی بارہا اپنے ہاتھ کی مشعل سے دوسروں کو راستہ دکھاتا ہے، اور خود نہیں دیکھ سکتا، معجزات کے وقوع پر بہت سے عقلی دلائل دینے کے بعد مولانا موصوف نے آگے یہ لکھا ہے کہ عام طور پر کارخانہ کائنات ایک مقررہ سنت یا بندھے ہوئے قوانین ہی کے ماتحت چلتا رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی خدا اپنے مرسلین اور مقربین کی تائید غیبی کے لیے اس سنت جاریہ میں مداخلت اور تغیر و تبدل کو بھی جائز رکھتا ہے، خواہ یہ تغیر و تبدل فطرت میں کسی نئے حذف و اضافہ کی وساطت سے ہو، یا اس کا منشاء براہ راست ارادہ الٰہی ہو، اس کو ان مثالوں سے سمجھ لینا چاہئے۔

ا۔ عام قانون فطرت یہ ہے کہ انسان کا بچہ بلا اتصال جنسی نہیں پیدا ہوتا، بلکہ اس اتصال جنسی سے جو مادہ تولید رحم مادر میں داخل ہوتا ہے اس کو خدا اگر خود رحم کے اندر ہی پیدا کر دے، جس طرح کہ اور بہت سی رطوبات جسم میں پیدا ہوتی رہتی ہیں، تو بلا اتصال جنسی لڑکا پیدا ہو سکتا ہے اور مداخلت خداوندی کی صورت فطرت میں ایک نئے عارضی اضافہ کی وساطت پر مبنی ہوگی، ممکن ہے ولادت مسیح میں خدا نے اپنی مداخلت کی اسی صورت سے کام لیا ہوا، اس طرح اضافہ کے بجائے حذف کی مثال یہ ہو سکتی ہے کہ چاند کے مختلف اجزاء جس کیمیاوی جذب و اتصال قوت سے آپس میں پیوستہ ہیں، ان میں صرف اس حصہ قوت کو جو چاند کے نصفین میں موجب اتصال ہے، تھوڑی دیر کے لیے خدا حذف یا سلب کر لے جس سے شق قمر

کا معجزہ ظاہر ہو سکتا ہے، تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ کسی مادی واسطہ کے حذف واضافہ کے بغیر براہ راست خدا نے صرف ارادہ کن سے قمر کو شق اور مسیح کو پیدا کر دیا ہو" (سیرۃ النبی ۳/۱۱۵)

وہ لوگ جو خرق عادت اور خلاف اسباب وعلل کے محال ہونے پر قرآن مجید کی ان آیتوں سے استدلال کرتے ہیں، جن میں سنت اللہ کے عدم تبدیل کا ذکر ہے، درحقیقت دانستہ یا نادانستہ مفہوم قرآن کی تحریف کے مجرم ہیں، قرآن مجید میں سنت الٰہی کا ایک خاص مفہوم ہے، اور اسی اصطلاح خاص میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، خیر وشر، حق وباطل، نور وظلمت اور ظلم وانصاف جب باہم ٹکراتے ہیں، بالآخر اللہ تعالیٰ خیر کو شر پر، حق کو باطل پر، نور کو ظلمت پر اور انصاف کو ظلم پر فتح اور کامیابی عطا کرتا ہے، گنہگار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتی اور پند وموعظت ان کے لیے موثر نہیں ہوتی تو اللہ ان قوموں پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے، اور بالآخر بجلی کی کڑک، آسمان کی گرج، زلزلہ کی تھرتھراہٹ، آندھی کی گھڑگھڑاہٹ، دریا کے تموج، پہاڑ کی آتش فشانی اور دشمن کی تلوار سے ہلاک اور برباد ہو جاتی ہے، یہ سنت الٰہی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے، اور اس میں کبھی فرق نہیں ہوگا، قرآن مجید میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے اسی مفہوم میں ہے۔ (سیرۃ النبی، ۳/۱۵۷)

غرض یہ کہ حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ نے اس دور میں جب نیچریت کا غلبہ ہو رہا تھا، معجزات کی مادی توجیہ کی جا رہی تھی، یا اس کا سرے سے انکار کیا جا رہا تھا، اور کتاب الٰہی کے ان قطعی الثبوت نصوص کے تعلق سے تشکیک پیدا کی جا رہی تھی، موصوف کا بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے جدید نسل کا اعتماد دین پر بحال کیا اور علوم جدیدہ کو مذہب کا خادم بنا دیا، اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے (آمین)

مولانا عبدالباری ندوی کا مذاق تصوف

''تجدید تصوف وسلوک'' کے آئینہ میں

مولانا محمد علاء الدین ندوی(۱)

اپنے فلسفیانہ تحقیقی اور تجدیدی کارناموں، ذہن رسا کی بلندیوں، فکر ونظر کی گہرائیوں، دبستان شبلی کے ہونہار شاگردوں، ندوۃ العلماء کے مایہ ناز فرزندوں اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے ممتاز خلفا، ان کے عاشقوں اور خوشہ چینوں کی طلائی زنجیر کی ایک سنہری کڑی کی حیثیت سے شہرت رکھنے والی شخصیت حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی ہے، آپ حکیم عبدالخالق (جو جسمانی معالج وطبیب تھے) کے فرزند ارجمند ہیں، اس باپ کا روحانی تعلق حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلیؒ سے تھا، مولانا ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے، تو انہی موصوف بزرگ نے تحنیک کی سنت ادا کی، خود مولانا عبدالباری لکھتے ہیں:

مرشد نے مجھ کو اپنی گود میں بٹھا کر مٹھائی کی ایک ڈلی اپنے منہ میں ڈالی اور وہی آدھی کاٹ کر میرے منہ میں ڈال دی۔(۱)

یہ تصوف کا پہلا ذائقہ تھا جسے مولانا نے بچپنے میں چکھا۔

مولانا دکن کالج پونا اور گجرات کالج احمد آباد سے ہوتے ہوئے اور گردش ایام کے تھپیڑوں سے گزرتے ہوئے بصد کامیاب وکامران جامعہ عثمانیہ حیدر آباد پہنچے، تو اپنے تدریسی وتصنیفی مشاغل کے ساتھ دکن کے ایک مشہور عارف وصوفی مولانا محمد حسین صاحبؒ کی خدمت میں اہتمام کے ساتھ اپنے یار غار مولانا مناظر احسن گیلانی کے ساتھ حاضری

(۱) وکیل کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

دینے لگے اور ان کی صحبتوں سے مستفید ہونے لگے۔'' مولانا محمد حسین شیخ محی الدین بن عربی کے قالاً و حالاً ترجمان تھے۔ (۲)

مولانا نے حضرت والا سے باضابطہ ارادت و بیعت کا تعلق تو قائم نہیں کیا، مگر ان کی فیضِ صحبت اور ان کے خم خانۂ معرفت کا خوب جام چڑھایا، بلکہ مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے تو اس عقیدت مندانہ تعلق کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> یہاں تک کہ حضرت مولانا عبد الباری صاحب ندوی تو انہیں وقت کا ابن عربی ہی کہا کرتے تھے، تحریری رنگ میں بھی مولانا ندوی کو ''فتوحات'' کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ (۳)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ان بزرگ کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

> یہ مولوی موصوف جج کے عہدے پر فائز تھے، لیکن چشتی سلسلے کے ایک بزرگ مچھلی شاہ صاحب کے مجاز و خلیفہ تھے، مولوی صاحب پر توحید کا غلبہ تھا، ان کی کوئی مجلس اور ملفوظ اس کے ذکر اور تذکیر سے خالی نہیں ہوتی تھی، صاحب قال ہی نہیں تھے، صاحب حال بھی تھے، ان کے توحید کے حدود توحید وجودی سے مل گئے تھے .... جن لوگوں پر بھی ارتیابیت کا حملہ ہو چکا ہو (اور ہمارے مولانا (عبد الباری صاحب) اس منزل سے گزر چکے تھے) اس مشرب و فلسفہ میں تسکین بلکہ تاثر کا بڑا سامان ہوتا ہے۔ مولانا لکھنو آتے تو منہ بھر بھر کر تعریف کرتے .... مولانا عبد الباری صاحب پر ان کی صحبت میں جو رنگ چڑھا تھا، اس نے مولانا تھانویؒ کی بیعت و صحبت سے ہلکا ہو کر اور نئے رنگ کے ساتھ مل کر ایک نیا رنگ پیدا کر لیا تھا، جس میں مولانا نے اپنی ذہانت سے کشمکش کے بجائے ہم آہنگی پیدا کر لی تھی۔ (۴)

حضرت مولانا نے جس ارتیابیت کے حملے کا ذکر کیا ہے اس کے بارے میں مولانا عبد الباری کے ایک ہونہار شاگرد جناب محمد نعیم صدیقی ندوی ایم اے دوسری ہی بات کہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ:

فلسفہ کے غیر معمولی شغف کے باوجود ان کے اندر شک وارتیاب کی کیفیت کبھی پیدا نہیں ہوئی، البتہ منقولات کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ عقلیت پسند بھی اس سے مطمئن ہو جائیں، بقول خود: "نقل کی کوئی بات عقل کی کسوٹی پر پوری طرح اترے بغیر مان لینا بڑی بے عقلی جانتا تھا؛ لیکن آگے چل کر ان کے اندر باطنی انقلاب رونما ہوا۔ (۵)

اس باطنی انقلاب اور تصوف کے نئے ذائقہ کا آغاز ۱۹۲۸ء میں ہوا۔ ہوا یوں کہ مولانا کے ہمراز ودمساز، ہم مشرب وہم مسلک اور دیرینہ رفیق مولانا عبدالماجد صاحبؒ کو کسی مرشد کی تلاش ہوئی، پھر ایک دن یہ دونوں حضرات حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خدمت میں باریاب ہو گئے، مگر دربار میں مخدوم ہی خادم بن گیا اور دونوں مہمانوں کی تواضع کرتا رہا، حضرت مدنی خود ان کو تھانہ بھون لے کر گئے، دونوں بزرگوں میں معمولی رد وقدح اور تخلیہ میں گفتگو کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت مدنی سے بیعت کا تعلق رہے گا اور حضرت تھانوی سے تربیت وارشاد کا، اس لذت آگیں کیفیت کی روداد مولانا عبدالباری صاحب نے بڑی تفصیل سے سنائی ہے، فرماتے ہیں: حضرت حکیم الامتؒ کی جوتیوں تک کیسے پہنچا، اس کو آگے سنئے:

مولانا عبدالماجد دریابادی سے میرے کم وبیش ساٹھ سال کے تعلقات ہو چکے ہیں جب وہ بی اے میں فلسفہ کے طالب علم تھے تو میں ندوہ میں متوسطات کا۔ ان پر عقلیت، ارتیابیت اور اس کے بعد الحادیت کا دور تک گذرا۔ احقر کے تعلقات ان سے اتنے زیادہ تھے کہ وہ اس راہ میں بھی رفیق طریق بنانا چاہتے تھے۔ ان کا رجحان مولانا مدنی کی طرف ہوا اور ان سے ان کا بیعت ہونا طے ہو گیا، جب ہم لوگ دیوبند اسٹیشن پر پہونچے تو دیکھا کہ مولانا تشریف فرما ہیں اور ڈبہ کا دروازہ کھلتے ہی بجائے قلی کے خود ہی ہم لوگوں کا سامان اٹھا لینا چاہا، کچھ طلباء بھی ساتھ تھے انہوں نے حضرت سے سامان لے جا کر تانگہ پر رکھ دیا اور ہم دونوں کو مولانا کے ساتھ بٹھا دیا، اس زمانہ میں آپ کا قیام حضرت شیخ الہند کے مکان پر تھا، ہم لوگوں کو بھی وہیں ٹھہرایا اور جس مدعا کے لئے حاضر ہوئے تھے اس کی نسبت فرمایا کہ میں

اس لائق بالکل نہیں، تم دونوں کو مولانا تھانوی سے بیعت ہونا چاہئے، ماجد میاں نے برجستہ اپنی ذہانت کا ثبوت دیا اور عرض کیا کہ حضرت سنا ہے کہ اس راہ کا پہلا قدم تو خودرائی کو فنا کرنا ہے اور ہم پہلے قدم پر آپ کی مخالفت کریں گے، تو آگے کیا چلیں گے اور اس قسم کے سارے معروضات سنے ان سنے فرمادئے اور دوسرے ہی دن غالباً پہلی گاڑی سے، ہم لوگوں کو لے کر تھانہ بھون پہونچے۔

حضرت تھانویؒ نماز کے بعد فارغ ہوئے ہی تھے کہ نظر حضرت مدنیؒ پہ پڑی اور پھر ان کو ساتھ لے کر اپنی مستقل نشست گاہ سہ دری میں تشریف فرما ہوگئے اور جلد ہی ہم لوگوں کو حاضری کا ارشاد ہوا۔ حاضری پر دیکھا تو دونوں میں موضوع یہ تھا کہ ہر ایک دوسرے کو کہہ رہا بلکہ اس پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ میں ان کے لائق نہیں، آپ ہی قبول فرمالیں، چند منٹ کے لئے دونوں حضرات نے تخلیہ بھی فرمایا اور اس کے بعد ہمارے حضرت مدنی اپنی ہی درخواست پر اصرار فرما رہے تھے، چنانچہ حکیم الامت قدس سرہ نے اپنے حکیمانہ رنگ کا جواب دے کر معاملہ ختم فرمادیا کہ میں نہ تو جنید و شبلی ہوں اور نہ ہی آپ، ان کے لئے دونوں کافی ہیں، مگر ان کو مناسبت آپ سے زیادہ ہے، اس لئے ان کو آپ ہی اپنے ساتھ لے جائیں، مناسبت کا اندازہ حضرت نے شائد اس طرح فرمایا کہ ماجد میاں تو اس وقت اپنے محبوب و ممدوح مولانا محمد علی مرحوم کے کھدری لباس میں سر سے پیر تک ملبوس تھے اور شاید اس وقت کی رائج الوقت کھدر ٹوپی میرے سر پر بھی تھی۔

دیوبند واپسی پر حضرت مدنی نے ہم دونوں کو بیعت فرمالیا تھا، آخر آخیر میرے دل میں بھی یہ تقاضا شدت سے پیدا ہوا کہ مستقل تھانہ بھون میں ہی پڑا رہوں، لیکن ملازمت کی زنجیر توڑنا آسان نہ تھا۔ اس کے لئے حضرت تھانوی نے خود حیدرآباد کے صدر اعظم نواب چھتاری کو نواب ممدوح کے سالے یا بہنوئی نواب باغپت کے ہاتھ سفارشی خط لکھا، صدر اعظم نے کار بھیج کر مجھ کو تیسرے پہر کی چائے پر مدعو کیا اور فرمایا کہ میں خود تمہاری سفارش کروں گا کہ تم کو قبل از وقت پنشن دے دی جائے مگر بدقسمتی یا خوش قسمتی کون بدل سکتا ہے،

یونیورسٹی کونسل نے جواب دیا کہ ان کی ملازمت میں ابھی پانچ سال اور باقی ہیں اور ہمارے پاس کوئی اور دوسرا آدمی بھی نہیں اس لئے کونسل عذر خواہ ہے۔

حضرت تھانوی نے بندہ پر جو عنایات فرمائیں ان میں ایک بات یاد آگئی، جس کی سعادت اس تباہ کار کے سوا شائد ہی کسی کو نصیب ہوئی ہے، اہل وعیال کے ساتھ تو کم وبیش تھانہ بھون میں زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ حاضری نصیب ہوتی، باقی آخر میں جب حیدر آباد سے گرمیوں کی تعطیل میں آجاتا تو ہفتہ یا دو ہفتہ کی حاضری ہوتی تھی، ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا کہ جب تم اتنی ہی مدت کے لیے آتے ہو تو میرے مہمان کیوں نہ ہو جایا کرو، اللہ تعالی نے میری زبان سے اور حضرت کی صحبت کی وجہ سے یہ نکلوایا کہ حضرت آخر میں کیوں اپنے کو اس سعادت سے محروم رکھوں؟ مگر کھانے کے اوقات و عادات صاف صاف بتاتا ہوں گے، احقر نے عرض کیا کہ معمولاً کھانا جو آپ کا ہوتا ہے، دال گوشت روٹی وہی احقر کا بھی ہے، البتہ ایک کوئی میٹھی چیز ضرور کھاتا ہوں، پھر دو وقتہ میٹھی چیز کوئی نہ کوئی ضرور ہوتی، کچھ نہیں تو دودھ میں جلیبیاں آخر تک یہی معمول رہا۔(۶)

پھر حضرت مدنی سے اس بیعت کے تعلق اور حضرت تھانوی کی صحبت وتربیت کے اثر سے وہ نمایاں مقام حاصل کیا کہ مولانا کے فضل وکمال اور راہ عشق و وفا میں اس ہونہار مرید کے امتیازات کا اعتراف دریائے تصوف کے بڑے بڑے شناوروں نے کیا، مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ تحریر فرماتے ہیں:

> مولانا (عبد الباری) مرحوم حضرت سیدی حکیم الامت کے خلیفۂ مجاز تھے مولانا نے حضرت کے دامن سے وابستہ ہو کر دنیا کی ہر آسائش کو چھوڑ دیا اور اپنی جائداد اور وسائل معاش کو خدمت دین کے لیے وقف کر دیا، زندگی بھر حضرت کے علوم و معارف سے نئی نسل کو روشناس کرایا اور حضرت کی متعدد تصانیف کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔(۷)

حق یہ ہے کہ اصلاح وارشاد کا تعلق قائم کر لینے کے بعد مولانا عبد الباری صاحبؒ

حضرت کے عاشق، ان پر دل وجان سے فدااور جاں نثار مرید بن کر دنیائے عشق ومحبت کی راہ میں ایک تاباں نقش چھوڑ گئے، بہتر ہے کہ ان کے الفاظ میں اس حدیث دلبر کو سنا جائے، فرماتے ہیں:۔

احقر حضرت کی زندگی کے جس پہلو سے سب سے زیادہ متاثر تھا وہ تقویٰ تھا، جس وقت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، دین اور دل کے امراض کے لحاظ سے مہلک امراض میں مبتلا تھا اس کے بعد جو کچھ بہتری اللہ تعالیٰ نے کسی اعتبار سے پیدا فرمائی وہ بالکلیہ حضرت حکیم الامت کے حکیمانہ معالجات اور جوتیوں کا صدقہ ہے۔

بیعت وارشاد کا ایسا صحیح متوازن اجتماع کہ دونوں میں فرق محسوس نہ ہو اگر کسی کو دیکھنا ہے تو خانقاہ اشرفیہ میں دیکھے............ اگر ایک طرف اللہ اکبر کی کامل نگہداشت السنة الجليلة في الجشتية العلمية سے تو دوسری طرف شیخ اکبر کی بڑائی کی حفاظت التنبيه الطربي في تنزيه ابن العربي سے ہے .... تعلیم وتربیت کے لیے تو کہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو پیدا ہی اسی لئے کیا ہے، ساری زندگی کا محور یہی معلوم ہوتا ہے............ بعض مرتبہ کوئی آدمی اپنا کوئی حال بیان کرتا ہے کہ دوسرا مرشد شائد اس کی ولایت کی تصدیق کر دے مگر حضرت یبوست دماغ کا علاج کرانے کی ہدایت فرماتے ہیں............ جتنا علم جتنا عمق اور جتنا ذوق واثر حضرت کی تحریروں میں ملتا ہے کہیں نصیب نہیں، حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کثیر تصانیف کے باوجود حضرت کا طرز تحریر اتنا قلیل اللفظ کثیر المعانی کیسے ہے، پھر اکثر دیکھئے گا کہ جس معنی ومفہوم کو جس لفظ و عبارت سے ادا کیا گیا ہے، جو صحت وجامعیت اس میں ہے، وہ اس کی جگہ دوسری تعبیر سے حاصل نہیں ہوتی، سچ پوچھئے تو انشا کا بھی کمال یہی ہے۔(۸)

اپنے ایک خط میں جسے حضرت تھانوی کی خدمت میں بھیجا گیا تھا اپنی محبت وعقیدت کا اظہار یوں کرتے ہیں:۔

سالہا سال سے حضرت والا کے قدموں سے تعلق کی سعادت حاصل ہے اور پھر ملفوظات وغیرہ پڑھتا رہتا ہوں اور خود بھی اپنے امراض واحوال عرض کرتا رہتا ہوں، پھر بھی حضرت کے ہر جواب میں تازہ علم اور تازہ اثر پاتا ہوں اور اب تو یہ اعتقاد ہو گیا ہے کہ اگر حضرت کی ساری تصنیفات حفظ کر ڈالوں تب بھی حضرت کی ذات اور اس کی برکات سے استغنا نہیں ہو سکتا۔

(تجدید تصوف وسلوک ص ۲۸۴)

اپنے شیخ حضرت تھانویؒ کے رنگ میں رنگ جانے کا یہ نقطہ انتہا تھا، ایک ایسا شخص جو قدیم وجدید کا سنگم تھا، جو ایک مشاق استاذ، ایک ماہر فلسفی اور اردو کا ایک بلند پایہ صاحب قلم تھا، جس کے ادب وانشا میں دبستان شبلی کی گہری چھاپ تھی، جس کے طرز استدلال میں پختگی اور شگفتگی تھی، جس نے 'مذہب وعقلیات' اور 'معجزات' سیرت النبی (پانچویں جلد) میں زبان وبیان کا اچھوتا نمونہ دکھایا تھا، وہ تھانوی رنگ میں رنگ جاتا ہے، تو خود اپنے قدیم طرز تحریر کو "تلبیس و تدلیس" کا شاخسانہ سمجھتا ہے، یہ ایک نہ سمجھ میں آنے والی صورتحال تھی، جو دیکھنے میں آئی، اس کا اظہار مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے رنگ کا مولانا عبدالباری صاحب پر ایسا غلبہ ہوا کہ مولانا (جن کی طبیعت میں ہمیشہ سے کسی چیز کو پورے طور پر قبول کرنے اور ماسوا کی نفی کی صلاحیت تھی) کے علمی خیالات اور طرز تحریر تک پر اثر پڑا وہ دبستان شبلی کے ایک کامیاب وممتاز ادیب وصاحب قلم تھے تحریر میں پختگی و شگفتگی، استدلال وعقلیت کا رکھ رکھاؤ اور زبان وادب کی چاشنی، جملوں کی برجستگی دونوں پہلو بہ پہلو ہوتے اور یہی مولانا شبلی کی تربیت کا فیض تھا، ان کا رسالہ 'مذہب وعقلیات' اور ان کا مضمون 'معجزات' پر جو سیرت النبی کے پانچویں حصے میں شامل ہے، اس کا نمونہ ہے، لیکن اب ان کو اپنے اس قدیم طرز تحریر میں تلبیس یا تدلیس کا (اور یہ الفاظ انہی کے ہیں) شبہ ہونے لگا اور انہوں نے مولانا

تھانوی کے طرز کی تقلید شروع کر دی، اگر چھوٹا منہ بڑی بات نہ سمجھی جائے تو بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ اس میں محبت کو دخل زیادہ تھا، عقل وزمانہ کے تقاضوں کی رعایت کو کم، اگر وہ ان حقائق کو بھی جو ان کو مولانا تھانویؒ کی صحبت یا ان کی کتابوں کے مطالعے سے حاصل ہوئے تھے دبستان شبلی ہی کی زبان میں ادا کرتے، تو اس جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے، جس کے لیے وہ کتابیں لکھتے تھے زیادہ مفید ہوتا اور نوجوانوں کا وہ طبقہ اور ملک کا دانشور حلقہ حقیقت دین سے زیادہ آشنا ہوتا۔ (۹)

مولانا کے مزاج اور طبیعت میں کسی چیز کو پورے طور پر قبول کر لینے اور ماسوا کو رد کر دینے یا اس کی نفی کر ڈالنے کی صلاحیت تھی، حضرت مولانا کی اس حقیقت بیانی اور درا کی کی روشنی میں مولانا عبدالباری صاحب کی زندگی کی عقدہ کشائی میں بڑی مدد ملے گی۔ جب ہم مولانا کی قیمتی تصنیف 'تجدید تصوف وسلوک' (جو ہمارے عنوان کا دوسرا جز ہے) مطالعہ کرتے ہیں تو حضرت مولانا کی حقیقت بیانی منہ بولتی تصویر بن کر سروقد کھڑی نظر آتی ہے۔

یہ کتاب ۱۹۴۹ء میں تنویر پریس سے شائع ہوئی ہے، اس کا مقدمہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نے تحریر فرمایا ہے، یہ ایک فاضلانہ اور محققانہ مقدمہ ہے جو 'حقیقت تصوف کے مکتشف اعظم اور فن احسان وتصوف کے مجدد کامل' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ علامہ نے کتاب اور مولف کتاب کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا ہے، جو کچھ ہے وہ صرف حضرت تھانویؒ کے تجدیدی کاموں کا جامع تعارف ہے۔

یہ ترتیب میں دوسری اور اشاعت میں (تجدید دین کے موضوع پر) پہلی کتاب ہے، ترتیب کے لحاظ سے پہلی کتاب جس کا پہلا اڈیشن 'جامع المجددین' کے نام سے شائع ہوئی تھی، بعض غلط فہمیوں سے بچنے کے لیے دوبارہ 'تجدید دین کامل' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

مولانا نے اپنی اس کتاب (تجدید تصوف وسلوک) میں تصوف کی حقیقت بتاتے ہوئے اسے 'فقہ باطن' سے تعبیر کیا ہے اور یہ کہ فقہ باطن فقہ ظاہر سے زیادہ اہمیت کا مستحق ہے،

مولانا نے انتہائی اہمیت کی حامل تصوف کی اصولی باتوں کو ملفوظات اور مکاتیب کی روشنی میں مرتب کیا ہے، واقعہ ہے کہ ہزاروں صفحات کی ورق گردانی اور اخذ و استنباط کے بعد یہ قیمتی مجموعہ تیار ہوا ہے، یہ کدوکاوش خود مصنف کی پتاماری، بیدار مغزی اور جنون عشق و وفا کا پتا دیتی ہے۔

یہ کتاب اس باکمال ہستی کا مرقع پیش کرتی ہے جو مجموعۂ کمالات اور جامع فضائل تھا، جس کی پوری زندگی تصوف کی اصلاح و ترویج میں صرف ہوئی، جس نے تصوف کے رخ زیبا پر پڑے بدعات کی سیاہ چادر کو ہٹایا، جس نے سلوک کی راہ کو از سر نو روشن کیا، جس نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کی ناقابل فہم تعبیرات کے بجائے اعمال، ذکر و فکر اور سنت و شریعت کا راستہ دکھایا، جس نے صوفیانہ خانوادوں کی موروثی جہالت اور رسوم کی گرم بازاری کی جگہ عقائد کی تصحیح، عبادت میں احسان کا حصول، اعمال میں اتباع سنت، معاملات میں حقوق العباد اور حقوق اللہ کو رواج دیا، شریعت و طریقت کو شیر و شکر کیا، امراض قلب کے حکیمانہ نسخے تجویز کیے، عبادت و بندگی کے اسرار بتائے، زبردست تفسیری کام کیا، حدیث کے مجموعے تیار کیے، فقہ و فتاویٰ کا قیمتی سرمایہ چھوڑا، دین کے اسرار و حکم کی تدوین کی اور تصوف کے اصولی اور اس کے احوال و کیفیات پر سیر حاصل بحث کی، خواتین اسلام کو بہشتی زیور عطا کیا، مواعظ و ملفوظات کی مشعلیں جلائیں، شکوک و شبہات کے پردے چاک کیے، باطل فرقوں کی تردید کی، اخلاق، اعمال اور معاملات کو خود بھی اپنی زندگی میں برتا اور دوسروں سے برتوایا اور ارشاد و تربیت و اصلاح کی وہ مجلسیں سجائیں جن میں علماء سے لے کر جہلا تک، خواص سے لے کر عوام تک نظر آتے ہیں، جن کے دائرۂ فیض میں مدارس بھی ہیں اور یونیورسٹیاں بھی، ان کے اثرات برصغیر میں بھی پھیلے اور دنیا کے ان خطوں میں بھی جہاں جہاں یہاں کے مسلمان جا کر بسے۔

'تجدید تصوف و سلوک' کے دو مقاصد بیان کیے گئے ہیں:

اول: سلبی پہلو سے تصوف کے متعلق ہر طرح کی گمراہیوں، غلط فہمیوں اور ہر طرح کی بدعات و خرافات کی تردید و ابطال۔

دوم: ایجابی پہلو سے حضرت تھانویؒ کے طریقت کے باب میں تجدیدی کارنامے کو واضح کرنا۔

انسان کے دورخ ہیں؛ ظاہراور باطن یا قالب اور قلب، اسی طرح شریعت کے بھی دورخ ہیں ظاہراور باطن، یا قالب اور قلب۔ طریقت نام ہے قلب یا باطن کی اصلاح کا، شریعت نام ہے فقہ ظاہر کا۔

مولانا کے نزدیک طریقت کے علم بردار صوفیا سے بلند درجہ صرف انبیا کا ہے، صوفیا ہمہ وقت اللہ تعالی کے مشاہدے وحضوری میں رہتے ہیں اور کسی نہ کسی نوع کے مکالمہ اور مناجات سے مشرف ہوتے رہتے ہیں۔

تصوف کے معاملے میں مولانا کی زودحسی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ صوفی ہوئے بغیر مسلمان مسلمان ہی کب ہوسکتا ہے۔ (۱۰)

عجیب بات یہ ہے کہ مولانا صوفی کے اصل کو صوف پوش کے بجائے اصحاب صفہ سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ (۱۱)

آپ نے عشق ومحبت کو تصوف کا جان بتلایا ہے اور اس کی تائید میں حضرت تھانوی کی عبارتیں پیش کی ہیں، حضرت تھانویؒ تصوف کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'تصوف نام ہے صفائی باطن مع پابندیٔ شرع کا'۔ (۱۲)

مولانا اہل اللہ کی صحبت کو عین دین قرار دیتے ہیں اور یہ کہ صحبت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا، فرماتے ہیں:۔

> بلاصحبت کے دین قلب وروح میں رچتا یا سرایت مشکل ہی سے کرتا ہے، ایسے عمل کی نوعیت (جس میں صحبت کی تاثیر ولذت نہ ہو) بس زیادہ سے زیادہ ایسے مزدور یا تنخواہ دار نوکر کے کام کی ہوتی ہے جس کو آجر یا آقا سے کوئی قلبی تعلق نہیں ہوتا...... غرض محققین اہل اللہ کی صحبت، یا یہ میسر نہ ہو تو کم از کم ان کے ملفوظات وغیرہ کا مسلسل بنظر اصلاح واستفادہ مطالعہ نہ صرف دین کی فہم وبصیرت

کے لئے ضروری ہے بلکہ اس سے اہل اللہ کا ایمان و عمل ہمارے اندر منتقل ہوتا ہے اور قالب سے تجاوز کر کے قلب و روح میں اتر تا ہے، یا رچ جاتا ہے۔

لیکن کیا عرض کیا جائے، اس بالکل عقلی بلکہ موٹی سی بات سے اچھے اچھے اہل علم کو ایسی بے پروائی ہے کہ محض اپنی علمی بلکہ دراصل محض معلوماتی و تصنیفی قوت اور نرے معلومات کی وسعت کو نہ صرف اپنی اصلاح کے لیے کافی سمجھ لیا ہے بلکہ اسی بھروسہ پر اصلاح کی مستقل تحریکوں کے امام وعلمبردار بن جاتے ہیں۔ (۱۳) تجدید......ص ۱۱۸)

مولانا صوفی کا ترجمہ پکا مسلمان بتاتے ہیں اور 'صوفی بنے بغیر دنیا بھی نہیں بن سکتی' کا عنوان قائم کرتے ہیں۔

اذکار و اشغال اور مجاہدات کو یکسوئی کا ذریعہ بتاتے ہیں کہ ان کی حیثیت طبی تدبیر کی ہے اور مقصود بالذات نہیں ہیں۔ (۱۴)

بیعت وارادت کے معنی بتاتے ہوئے کہتے ہیں ''بیعت کے معنی ہیں اس منزل مقصود کے لئے کسی زیادہ واقف کار کو رہبر و رفیق بنالینا اور اس کے پیچھے یا ساتھ چلنا تا کہ نہ صرف گمراہی سے حفاظت ہو بلکہ راستہ بھی سہولت و راحت سے قطع ہو۔ (۱۵)

عشق و محبت کی بابت کہتے ہیں: ''عشق و محبت کا لازمہ تصوف یا عین تصوف ہونا مسلمہ ہے''۔ (۱۶)

باطنیت کے جلی عنوان کے تحت مولانا فرماتے ہیں: جس طرح سے فقہ کے ظاہری احکام تمام تر کتاب وسنت ہی میں منصوص یا اس سے ماخوذ ہیں اسی طرح تصوف کے باطنی احکام بھی بالکلیہ قرآن وحدیث ہی کے منصوصات یا ان پر مبنی ہیں۔ (۱۷)

آگے فرماتے ہیں:

بعض ضمنی مصالح و منافع کی بنا پر تصوف کی تعلیم میں کچھ اخفا سے کام لیا جاتا ہے۔ (۱۸)

اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ باطنیت کی ہی راہ سے اور تصوف کے حوالے سے قرآن کی ظاہری اور باطنی تفسیر کا فتنہ امت میں در آیا ہے۔

کتاب کا ایک جلی عنوان ''وحدۃ الوجود'' کا ہے، اس کتاب میں اس مسئلے کا بھر پور دفاع اور پر تکلف تاویلات سے کام لیا گیا ہے اور شیخ اکبر کو مقبولان بارگاہ میں شمار کیا گیا ہے(۱۹) البتہ اس پر بزرگان سلف کے حوالے بھی ہیں۔

''تجدید تصوف وسلوک'' کے نام سے اپنے حضرت حکیم الامت کے تجدیدی کاموں کا جو حسین مرقع مصنف نے پیش کیا ہے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

> الحمد للہ اسلامی تصوف اور سچے مسلمان صوفیوں پر جاہلوں اور دکانداروں نے جہالت اور نفسانیت کے جو پردے ڈال رکھے تھے حق تعالی نے مجدد وقت کے ہاتھوں پارہ پارہ فرما کر حق کو کیسا ظاہر و بے غبار کر دیا۔(۲۰)

خود حکیم الامت اس نعمت عظمی کا شکر ادا فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

> اللہ کا شکر ہے کہ مدتوں بعد اس فن کی تجدید ہوئی اور طریق روز روشن کی طرح سے صاف و بے غبار ہو گیا، ہر چیز اپنے درجے پر نظر آنے لگی۔(۲۱)

مولانا کے مزاج میں ایک گونا شدت اور ایک سمت کو جھکاؤ کا رجحان تھا، جب کسی ایک فکر کو قبول فرما لیتے تھے تو ماسوا کی نفی کا رجحان غالب آجاتا تھا، یہ بات راقم کہے تو چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خیال ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:۔

> مولانا عبدالباری صاحب میں ایک حد تک شدت اور بے لچک پن تھا وہ اپنے خلاف مزاج وخلاف اصول کسی چیز کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس وجہ سے ان کے چھوٹے اکثر ان سے خائف اور ان سے دور رہتے تھے، اور گھر کے کم افراد ان کے معیار پر پورے اترتے تھے، ان کی اسی مزاجی خصوصیت کو مولانا مدنی نے ایک مرتبہ اس بلیغ جملہ میں ادا کیا کہ ''مولانا عبدالباری چاہتے ہیں کہ شیطان مر جائے اور ایسا ممکن نہیں۔(۲۲)۔

اس جملے کی تہہ میں اترا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ مولانا جس بلند سطح سے نظریں

ڈال کر اور مسلمانوں کو اعلی کسوٹی پر رکھ کر ان کی مسلمانیت کو پرکھنا چاہتے تھے، اس میں وہ نظریۂ مثالیت (Adia lism) سے قریب تر نظر آتے ہیں، اس معاملے میں مولانا کی غیرت دینی شدت اختیار کر لیتی ہوگی اور غالباً مولانا کے اسی دینی تصلب کی وجہ سے جناب احمد الباری صاحب نے اپنے والد ماجد کو بیسویں صدی کا عمر بن خطاب بتایا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

> راقم سطور کی نظر میں اور سمجھ میں والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ بیسویں صدی عیسوی کے "عمر بن خطاب" تھے۔ (۲۳)

کاش کہ موصوف اس مجمل جملے کی کچھ تفصیل بیان فرما دیتے کہ کن کن کارناموں کی وجہ سے آپ بیسویں صدی کے عمر بن خطاب تھے۔

یہ دعوی کہ مولانا کے اندر ایک طرح کی شدت اور بے لچک پنا تھا، اور یہ کہ جو بھی اہل تصوف کی صحبت سے محروم رہا وہ لازماً علمائے ظاہر میں اور نرا خشک عالم ہوگا، اس کی تصدیق و تائید کے لئے صرف چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ مولانا اپنی کتاب 'تجدید تصوف و سلوک' میں فرماتے ہیں: 'دین میں کمال رسی اور حقیقت یابی بلا تصوف یا صوفی بنے بغیر ممکن نہیں، اس دعوی سے اہل قشر کتنا ہی ناخوش ہوں لیکن مغز مغز ہی ہے" (۲۴)

انہی اہل علم کے بارے میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:۔

> علم برائے علم اتنا مقصود بن گیا ہے کہ علمائے دین و مدارس میں بھی سارا زور معلومات اور کتابوں ہی پر ہے، امتحان ہے، تو ان کا انعام ہے تو ان پر سند ہے۔ (۲۵)

نیز فرماتے ہیں: 'غرض ایک تو عمل ہی سرے سے مفقود ہے اور جو کچھ ہے، وہ بھی صورت بے معنی یا جسد بلا روح۔" (۲۶)

نیز فرماتے ہیں:۔

> پھر ہمارے یہ قائدین و مصلحین رنگ رنگ کے جھنڈے لے کر اور طرح طرح کی جماعتیں اور مجالس آگے پیچھے اسلام اور اسلامی کا لفظ لگا کر مسلمانوں کو اپنے حال کی جس اصلاح و انقلاب کی دعوت دے رہے ہیں، خوب یاد

رکھیں کہ وہ اس راہ سے پہلے کی طرح آئندہ بھی صدا بصحرا اور جسد بے روح ہی رہے گی، جب تک انقلاب قلب یعنی تصوف کی راہ نہ اختیار کی جائے۔(۲۷)

فرماتے ہیں:۔

حضرت علیہ الرحمۃ نے ایک 'مولوی صاحب' کو دو جملوں میں تصوف کی حقیقت بتلادی تھی، مگر انہوں نے قدر نہ کی، آخر مولوی صاحب تھے۔(۲۸)

اپنی مادر علمی ندوۃ العلماء کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

اللہ کی رحمت نے باطنی امراض کے باب میں حضرت علیہ الرحمہ کے تعلق وتربیت کے بعد دستگیری فرمائی......حالانکہ تعلیم وتربیت تمام تر ایک ایسی درسگاہ میں ہوئی تھی جس کا طرۂ امتیاز ہی بے قیدی وآزادی ہے۔(۲۹)

مولانا اہل علم کو اہل ظاہر، خشک علماء جیسے الفاظ سے بار بار تعبیر فرماتے ہیں ایک جگہ ارشاد ہے:۔

جو لوگ انکشاف اسرار اور غلبۂ محبت کو نہیں جانتے کہ کیا ہے جیسا کہ عامۃ الناس اور اہل ظاہر کا حال ہے تو ان کے لیے یہ تفصیل بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔(۳۰)

خیالات کے اس شدت کے باوجود یہ کتاب تصوف کا علم کلام، راہ سلوک کا وقیع ترجمان اور تزکیہ واحسان کا ایک حد تک مبلغ وداعی ہے، حضرت مولانا نے حضرت جامع المجددین کے اصل کارنامے پر روشنی ڈالی ہے، میں انہیں نمبروار انہی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں:۔

۱- شریعت وطریقت کے دو کیمپ بن گئے تھے آپ نے ان کو ایک وجود بنادیا۔
۲- 'بہشتی زیور' باعتبارِ تعمیم تجدید کا بنیادی پتھر ہے۔
۳- 'تعلیم الدین' تجدید کی بنیادی کتاب ہے۔
۴- تعلیم وتبلیغ حضرت کا بنیادی کارنامہ ہے۔(۳۰)

اور اس کتاب (تجدید تصوف وسلوک) کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے،

'حضرت جامع المجدد دین کی تجدید وتصوف میں سب سے زیادہ اہمیت اعمال خصوصاً اعمال قلب کو حاصل ہے، یہ سالک کو اپنے منزل تک پہنچا کر ہی دم لیتی ہے'(۳۱)

بلاشبہ یہ حضرت مجدد کا عظیم کارنامہ ہے اور اس عظیم کارنامہ کو حضرت مولانا عبد الباری صاحبؒ نے اپنے گہرے مطالعے، مشاہدے اور اخلاص کے جذبے سے افادۂ عام کی خاطر پیش کیا ہے۔

حواشی

(۱) حیات عبدالباری از سید محمود حسن حسنی ندوی ص ۴
(۲) حیات گیلانی ص ۲۵۱۔
(۳) حاشیہ مکاتیب گیلانی ص ۱۲۵
(۴) پرانے چراغ ۲/۱۲۰
(۵) معارف مارچ ۱۹۷۶ء
(۶) بزم اشرف کے چراغ ۲۷۶
(۷) منقول از حیات عبدالباری ص ۱۴۳-۱۴۴
(۸) بزم اشرف کے چراغ ص ۲۷۹-۲۸۳
(۹) پرانے چراغ ۲/۱۲۳
(۱۰) تجدید وسلوک ص ۸
(۱۱) ایضاً ص ۱۵
(۱۲) ایضاً ۱۱۸
(۱۳) ایضاً ص ۹۹
(۱۴) ایضاً ۱۲۰
(۱۵) ایضاً ۱۴۲
(۱۶) ایضاً ۱۴۴
(۱۷) ایضاً ۱۵۳
(۱۸) ایضاً ۴۹۵
(۱۹) ایضاً
(۲۰) ایضاً ص ۱۱۸
(۲۱) پرانے چراغ ص ۱/۱۲۷
(۲۲) تجدید تصوف وسلوک ص ۱۸
(۲۳) ایضاً ۲۲
(۲۴) ایضاً ص ۲۳
(۲۵) ایضاً ص ۲۷
(۲۶) ایضاً ۸۶
(۲۷) ایضاً ۱۱۶
(۲۸) ایضاً ۴۴۰
(۲۹) ایضاً ۲۲۸
(۳۰) ایضاً ص ۳۔

مولانا عبدالباری ندویؒ

اوراسلامی اقامت خانوں کی دعوت اوراس کے اثرات

محمود حسن حسنی ندوی(۱)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے علامہ سید مناظر احسن گیلانی کے تذکرہ میں ان کی اس فکرودعوت کونمایاں کیا ہے کہ انہوں نے اسلامی اقامت خانوں کی تجویز پیش کی تھی، بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی:۔

> مولانا کا ایک دیرینہ خیال یہ تھا کہ اسلامیہ کالجوں اوراسکولوں کے بجائے جن کا ایک زمانہ میں ہندوستان میں عام مذاق پیدا ہوگیا تھا، اور مسلمانوں کی بہترین تنظیمی وعلمی ومالی صلاحیتیں ان پرصرف ہوئیں اس وقت اسلامی اقامت خانوں کی ضرورت ہے جن میں وہ مسلمان طلبہ قیام کریں جومختلف سرکاری وغیرسرکاری مسلم اورغیر مسلم درسگاہوں سے وابستہ ہوں اوران کے اندر اسلامی ودینی فضا اورغذا مہیا کرنے کی کوشش کی جائے، تا کہ وہ اپنی درسگاہوں کے لادینی ماحول اورتعلیم کے اثرات سے امکانی حد تک محفوظ اوراسلامی افکار واخلاق سے متاثر ہوں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تجویز ''کم خرچ بالانشیں'' کے مرادف اوراسلامیہ کالجوں اور اسکولوں سے (جن کی افادیت اب بہت مشتبہ ہوگئی ہے، اور جوانقلاب حکومت سے اپنی خصوصیات کھوتے چلے جارہے ہیں)

---

(۱) نائب مدیر پندرہ روزہ تعمیر حیات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

کہیں بہتر نتائج وثمرات پیدا کر سکتی ہے اور جدید تعلیم کے غیر اسلامی اثرات سے
بچانے اور نئی اسلامی نسل کو (جس کا جدید تعلیم حاصل کرنا ایک طے شدہ حقیقت
اور ایک ناگزیر ضرورت ہے) مسلمان باقی رکھنے کی واحد شکل ہے۔

اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا فتنہ اسی نوخیز نسل کا غیر اسلامی بلکہ
معاند اسلام ذہن اور نفاق ہے، جس نے تمام اسلامی ممالک کو (جن کی زمام
اقتدار قدرتی طور پر اسی طبقہ کے ہاتھ میں ہے) الحاد وزندقہ کے دوراہے پر کھڑا
کر دیا ہے اور ایک سخت ذہنی انتشار وکش مکش بلکہ اسلام کے خلاف بغاوت کا
علمبردار بنا دیا ہے۔ مولانا کی یہ بڑی دینی بصیرت تھی کہ انہوں نے اسلامی
اقامت خانوں کی تجویز پیش کی، جو کم از کم ہندوستان کے موجودہ حالات میں
اس مسئلہ کا ایک علمی اور معقول حل ہے۔ (پرانے چراغ، حصہ اول، ص: ٦۵)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۱۹۴۷ء میں اپنے رفیق وصدیق مکرم
مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے ساتھ ادارۂ تعلیمات اسلام کے ترجمان ''تعمیر'' کے اجراء
کے ذریعہ مسلمانان ہند کی احساس کہتری اور مایوسی کو دور کرنے کے ذریعہ جو ۱۹۴۷ء کے تقسیم
ہند کے بعد کے واقعات سے پیدا ہوئی دور کرنے کے جذبہ سے کیا، علامہ سید مناظر احسن
گیلانی نے اپنی اس دعوت کا جوان کے نزدیک اس کے لئے بڑا مؤثر ذریعہ تھا اس رسالۂ
''تعمیر'' کو ترجمان بنانا چاہا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ:۔

مولانا نے ''تعمیر'' کو اس دعوت کا ترجمان بنانا چاہا، اور اس سلسلہ میں ان
کے متعدد مکاتیب ومضامین شائع ہوئے، افسوس ہے کہ ان کی اس تحریک کو کسی
بڑے ادارے یا انجمن نے نہیں اپنایا اور اس کو تحریک ودعوت نہیں بنایا گیا، ورنہ وہ
صرف کالجوں اور اسکولوں کے مقابلہ میں بلکہ ان یونی ورسٹیوں کے مقابلہ میں
زیادہ مفید اور انقلاب انگیز ثابت ہوتی جن پر مسلمانوں کی بہترین طاقتیں
اور عظیم قومی سرمائے صرف ہوئے۔ (پرانے چراغ، حصہ اول، ص: ٦۵-٦٦)

البتہ مولانا عبدالباری ندوی کی شخصیت وہ شخصیت تھی جس نے اس فکر کواوڑھ لیااور اس کی پرزوردعوت کے ساتھ اس کو عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کی۔ حضرت مولانا سیدابوالحسن علی ندوی رقم طراز ہیں:۔

> مولانا کے انتقال کے بعدان کے شریک کاراور یارغار مخدومی مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے ''صدق'' کے ذریعہ اقامت خانوں کے قیام کی دعوت پیش کی اوراس کے لئے عملی قدم بھی اٹھایا۔ (بحوالہ سابق)

ایک دوسرے مصنف ومحقق عالم دین مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی مفتی دارالعلوم دیو بند اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں:۔

> یونی ورسٹی کے تعلق سے ان نوجوانوں کے ذہن وفکر سے بہت اچھی طرح واقف ہوچکے تھے، جو ملک کے مختلف حصوں میں سرکاری تعلیم گاہوں میں پڑھ رہے تھے کہ ان کا اندازفکر کیا ہے، یہ مذہبی تعلیم سے علماً وعملاً کس قدر دور ہیں، اورموجودہ دور کا سیلاب انھیں کس قدر پامال کرسکتا ہے۔
>
> (حیات عبدالباری، ص:۳۵۹)

اوران دونوں عظیم شخصیتوں کے مثلث مولانا عبدالماجد دریابادی اس فکر کے امتداد میں حضرت مولانا سیدابوالحسن علی ندوی کوبھی شریک کرتے ہیں کہ انہوں نے اس نظریہ وفکر کو عالم اسلام خصوصاً بلاد عربیہ میں پہنچایا جہاں کے نوجوانوں کا شکار یورپ کررہا تھا، اوروہ وہاں جاکرایمان سے تشکیک کی طرف چلے جاتے تھے، حضرت مولانا سیدابوالحسن علی ندوی کوخاص طور پراپنے یورپ کے سفر میں عالم اسلام کے نونہالوں کی حالت زار کودیکھ کرقلق ہوا، صدق ۱۷رجنوری ۱۹۶۴ء میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا نوٹ ملاحظہ ہو:۔

> اب تو سفر یورپ سے واپسی پرخود ہمارے علی میاں اس کفرستان تک تعلیم پانے والے مسلمان طلبہ کے لئے یہ تاثر اور پیام لے کرآئے ہیں، کہ جہاں تک مسلمان طلبہ اورنوجوانوں کا تعلق ہے جو یہاں لاکھوں کی تعداد میں انگلستان، فرانس، جرمن، اسپین میں زیرتعلیم ہیں، ان کی اصلاح وتربیت اور

ان کی اسلامیت کی حفاظت کے لئے سب سے بہتر نسخہ وہ ہے جو ہندوستان کے لئے مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تجویز کیا تھا، اور اب ہمارے مولانا عبدالباری ندوی اس کے علمبردار اور داعی ہیں یعنی طلبہ کے لئے اقامت خانوں کی تاسیس اور ان میں اچھے نگراں اور مربی کا انتظام۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جو بات مولانا سید مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی کے فکر ونظریہ سے متعلق تحریر کی تھی اور پھر خود اس کی ضرورت کا انہیں بہت زیادہ احساس اپنے سفر برطانیہ، جرمن اور اسپین (اندلس) میں ہوا جس کا تذکرہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے کیا ہے اس کی پرزور دعوت اپنی کتاب "الصراع بين الفكرة الإسلاميه والفكرة الغربية في الأقطار الإسلامية" (مسلم ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش) میں دی ہے، جس میں انہوں نے صاف طور پر یہ دعوت دی کہ:۔

جدید اسلامی نسل کا معاملہ ایک دن کی تاخیر اور التواء کا روادار نہیں مندرجہ بالا کام کی تکمیل تک (اور حقیقۃً اس کی موجودگی میں بھی) یہ کام اسلامی اقامت خانوں (Muslim Hostels) سے لیا جاسکتا ہے، جن میں یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے مسلم طلبہ قیام کریں اور وہاں اسلامی تربیت، اسلامی زندگی اور ماحول کے قیام اور صالح ذہنی وروحانی غذا کے مہیا کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے....

(ص:۵۴-۵۵، اردو ایڈیشن)

پھر مزید وہ مغربی ممالک میں اس کی ضرورت باور کراتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ان اسلامی اقامت خانوں کی مسلم ممالک کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی ضرورت ہے جہاں وہ مسلمان نوجوان بڑی تعداد میں تعلیم پاتے ہیں، جو ذہانت وقوت عمل میں ملت کا سرمایہ اور جوہر ہیں، اور جن کے لئے بالعموم (اپنی ذہنی صلاحیتوں اور مغربی علوم وسیاست سے واقفیت کی بنا پر) گویا مسلم ممالک کی قیادت اور کم سے کم ان کی کلیدی جگہیں مقدر ہوچکی ہیں، اگر ان مرکزوں میں ان کے رجحانات کی اصلاح اور اسلامی ذہن کی تعمیر کا سامان کیا

جاس کے، اوراسلام اوراس کے مستقبل پران کا اعتماد بحال کیا جاس کے تواس خاموش کام کے ذریعہ ان مسلم ممالک میں خاموشی کے ساتھ وہ اسلامی انقلاب لایا جاسکتا ہے جن کی قیادت دیر یا سویر یہ نوجوان سنبھالنے والے ہیں، اور یہ طریقہ ان تمام طریقوں سے زیادہ آسان اور محفوظ معلوم ہوتا ہے جس کا عرصہ سے براہ راست ان ممالک میں تجربہ کیا جارہا ہے۔ (بحوالۂ سابق)

البتہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس کا سہرا اپنے مثل استاد بزرگوں علامہ سید مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی کے سر ہی باندھتے ہیں اور لکھتے ہیں:

اسلامی اقامت خانوں کے قیام کی تحریک سب سے پہلے مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اٹھائی، ان کے بعد اس تحریک کے سب سے بڑے داعی، ان کے رفیق اور ہمارے مخدوم مولانا عبدالباری ندوی مرحوم تھے جو اس موضوع پر برابر مضامین لکھتے اور دردمند وفعال مسلمانوں کو توجہ دلاتے رہتے تھے۔ (بحوالۂ سابق)

جہاں تک نتائج واثرات کا تعلق ہے تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے صرف اپنی تحریر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بلاد عربیہ، یورپ وامریکہ اور برصغیر میں اپنے خطابات، اور خصوصی وعمومی ملاقاتوں کے ذریعہ اہل فکر واہل قلم اور اصحاب جاہ وثروت کو بھی متوجہ کیا، جس کے اثرات اب صاف طور پر ظاہر ہورہے ہیں، اور مختلف تنظیموں اور افراد کے ذریعہ یورپ، بلاد عرب، برصغیر وغیرہ اور دوسرے مقامات پر یہ کوششیں اپنے ثمرات کے ساتھ نظر آرہی ہیں، جس کی تفصیل کا موقع نہیں، باقی ان اللّٰہ لا یضیع اجر المحسنین.

حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ
ایک عارف اور ولی

محمد مسعود عزیزی ندوی (۱)

حضرت مولانا عبدالباری ندوی کا وطن ضلع بارہ بنکی کا قصبہ ''گدیا'' تھا، مولانا نے ایک خوشحال گھرانے میں آنکھیں کھولیں، آپ کا خاندان دنیاوی ثروت و وجاہت کے ساتھ دولت دین سے بھی بہرہ مند تھا، یعنی خوش حال بھی تھا، اور خوش مال بھی، سن ولادت ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۹۰ء ہے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ان کے والد ماجد نے ان کو ندوہ میں داخل کیا، ندوہ میں دوران تعلیم کچھ مدت کے لیے نگرام میں بھی تعلیم حاصل کی، پھر دوبارہ ندوہ میں داخل ہوئے اور یہیں سے ان کے جوہر چمکے، مولانا شبلی نعمانی کی مردم شناس نگاہ نے اس جوہر قابل کی تربیت کی، فلسفہ قدیم کا مذاق پیدا کیا، علم الکلام کے کوچوں سے آشنا کیا، مولانا شبلی کی تربیت کی سان پر چڑھ کر مولانا عبدالباری ندوی کی ذہانت کی تلوار تیز سے تیز تر ہوگئی، مولانا نے اپنی ذہانت سے فلسفہ قدیم کے بعد فلسفہ جدید کا مطالعہ کیا، انگریزی کی استعداد بڑھائی اور فلسفہ جدید کے سمندر میں غوطے لگا کر اس کے نایاب موتیوں کو دین کے قدموں پر لا کر رکھ دیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا نے پونہ کالج میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر حمد آباد میں تبادلہ کرالیا، وہاں کے دوران قیام ان کی مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی صدر الصدور امور مذہبی حیدر آباد سے ملاقات ہوگئی، جو مولانا کے حیدر آباد جانے کا ذریعہ بنی، مولانا

---

(۱) رئیس مرکز احیاء الفکر الاسلامی، مظفر آباد، سہارنپور

شیروانی کے توسط سے مولانا کو علم الکلام پر ایک مستقل کتاب لکھنے کی پیش کش ہوئی اور اس کا معاوضہ پیشگی دوسو روپئے کے ساتھ دو سال تک فیلوشپ جاری رکھنے کا پروانہ ملا، اور اس عرصہ میں یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ جدید کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہو چکا تھا۔

حضرت مولانا عبدالباری ندوی کو بیعت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے حاصل تھی، جس طرح مولانا عبدالماجد دریابادی حضرت مدنی سے بیعت تھے، مگر ان دونوں کی تربیت حضرت تھانوی نے فرمائی، وہ صرف اپنی عزیمت کے بل پر خانقاہ تھانہ بھون کے شیخ، حکیم الامت کے محبوب ومقرب بن گئے۔

اب وہ فلسفہ کا مطالعہ کرتے تو ان کو حضرت تھانوی کے ملفوظات کی روشنی میں جانچتے، اقتصادیات ومعاشیات کی کوئی گتھی نظر آتی تو اس کو حضرت تھانوی کے ناخن تدبیر سے حل کراتے، تعلیم وتربیت کا کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ حضرت تھانوی کے مذاق تربیت کو عنوان بنا کر اس پر گفتگو کرتے، چنانچہ مولانا عبدالباری ندوی کی وہ کتابیں جو انھوں نے مرشد تھانوی کی وفات کے بعد لکھی ہیں، جامع المجد دین (یعنی جامع اوصاف المجد دین) تجدید معاشیات، تجدید تصوف وسلوک، تجدید تعلیم وتبلیغ، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا پر وہ غلبہ حال تھا کہ عصر حاضر کی تمام تر الجھنوں، مشکلات، مادی، علمی وروحانی مصائب کا حل شفاخانہ تھانہ بھون سے حاصل کرنے کی ترغیب دیتے رہے اور اگر ان کتابوں کا سنجیدگی سے، عصبیت وخودرائی سے بے نیاز ہو کر مطالعہ کیجئے تو بات معقول اور برمحل نظر آئے گی، چونکہ حضرت تھانوی کی صحبت وتربیت سے آپ نے سلوک کی تکمیل کر لی تھی، اس لئے حضرت تھانوی نے آپ کو اجازت وخلافت سے بھی نوازا۔

حضرت مولانا عبدالباری صاحب کہاں تو ایک فلسفی تھے، مگر حضرت مدنی وحضرت تھانوی کی صحبت ومعیت نے ان کو ایسا ہیرا بنا دیا کہ پھر وہ زبردست عارف بن گئے ان کے ہر عمل، قول وفعل میں اتباع سنت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کا احترام ان کی ایک اہم صفت تھی، ان کی دینی حمیت، دینی غیرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ

منکرات کے سلسلہ میں ذرا بھی مداہنت نہ برتتے، یہی وجہ تھی کہ حضرت مدنی کو ایک مرتبہ یہ کہنا پڑا کہ ''مولانا عبدالباری صاحب چاہتے ہیں کہ شیطان مر جائے اور یہ ممکن نہیں'' اس سے ان کے دینی مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

غرضیکہ حضرت مولانا عبدالباری صاحب میں وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں جن سے وہ فرشتہ صفت انسان معلوم ہوتے ہیں، اور ایک ولی کامل، اہل اللہ کی تمام خصوصیات ان کے اندر پیدا ہو گئی تھیں، اور آپ کی تصنیفات ان خصوصیات کی ترجمان ہیں، اس طرح مولانا عبدالباری صاحب نے درس وتدریس، اصلاح وتربیت، دعوت وارشاد اور تصنیف و تالیف کا فریضہ زندگی بھر بحسن وخوبی انجام دیا، یہاں تک کہ سفر آخرت کا وقت آ گیا اور مولانا نے ۲۸ر محرم ۱۳۹۶ھ ہجری مطابق ۳۰ جنوری ۱۹۷۶ء کو بروز جمعہ عالم ناسوت سے عالم بقا کی طرف کوچ کیا، اور ڈالی گنج لکھنؤ میں تدفین عمل میں آئی، حضرت مولانا عبدالباری صاحب نے بیس کے قریب تصنیفات یادگار چھوڑیں، جو ان کے لئے صدقہ جاریہ ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا کے درجات بلند فرمائے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھو کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

مولانا عبدالباری ندویؒ کے خطوط بنام مولانا محمد عمران خان ندوی ازہریؒ-ایک مطالعہ

ڈاکٹر سفیان حسان ندوی(۱)

نحمده و نصلي على رسوله الكريم، أما بعد!

مولانا عبدالباری ندویؒ کا شمار ندوۃ العلماء کے ان مثالی فضلاء میں کیا جاتا ہے جنہوں نے صرف ندوۃ العلماء کی سند کی بنیاد پر اور ندوۃ العلماء کی تعلیم وتربیت سے بھرپور استفادہ کرکے اور مختلف النوع علمی، تعلیمی، تحقیقی جہتوں میں اپنی ذاتی صلاحیتوں، نجی کاوشوں کو فروغ دے کر قدیم صالح اور جدید نافع کا ایک ایسا عملی نمونہ پیش کیا جس کا اعتراف ان کے عہد کے عصری ماہرین تعلیم نے کیا، ان کی گوناگوں علمی، تحقیقی کاوشوں نے ایسی قلمی نگارشات ورثہ میں چھوڑی ہیں جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے مختلف علمی میدانوں میں کتنی ورق گردانی کی ہوگی کہ جامعہ عثمانیہ جیسی عصری تعلیم گاہ میں شعبۂ فلسفہ کی صدارت کے فرائض انجام دئے اور فلسفہ جیسے دقیق موضوع پر ایسی مہارت پیدا کی کہ بقول علامہ حبیب الرحمٰن خان شیروانی صاحبؒ کہ ''فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا ہے''۔(۱)

مولانا نے اپنی ذاتی محنت سے انگریزی زبان میں وہ کمال پیدا کیا کہ دکن کالج پونہ میں فارسی کے لیکچرار کی حیثیت سے تقرر ہوا اور فارسی اور اردو کی کلاس میں انگریزی میں لیکچر دینا شروع کیا اور ''دیوانِ حافظ'' جیسی بلند اور پُر از تلمیحات ورموز کتاب کو انگریزی میں حل کرکے طلبہ کو مطمئن کیا، گجرات کالج احمد آباد میں مذہب وعقلیات کے موضوع پر

---

(۱) دارالعلوم تاج المساجد بھوپال۔

زبانی لیکچر دیا جو بعد میں ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہوا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندویؒ اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' حصہ دوم میں تحریر فرماتے ہیں:۔

مولانا عبدالباری ندوی صاحب کو فلسفہ کا خاص ذوق ندوہ کی طالب علمی میں وہاں کے جید اساتذہ سے جن میں مولانا سید شیر علی صاحب حیدر آبادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، سے ہوا، آپ نے فلسفہ قدیم کی اعلی کتابیں دلچسپی اور محنت سے پڑھی تھیں اور درسیات کے حدود سے قدم باہر نکال کر اس موضوع پر آپ نے وسیع مطالعہ کیا تھا پھر مولانا شبلی کی صحبت میں ان کو فلسفۂ جدید اور علم کلام کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے انگریزی میں اتنی استعداد بہم پہنچا کر کہ وہ فلسفہ کی کتابوں کا بہ اطمینان مطالعہ کر سکیں، اس کا غائر نظر سے مطالعہ کیا، اللہ تعالی نے انہیں ذہن رسا اور نکتہ شناس بنایا تھا، انہوں نے بہت جلد مغز کی بات پالی اور جن نتائج تک لوگ بڑی غواصی اور شناوری کے بعد پہنچتے ہیں اپنی سلامت طبع اور خدا کی رہنمائی سے وہ ان نتائج تک جلد پہنچ گئے اور انہوں نے ''فلسفہ وعقلیات'' کے حدود بہت جلد متعین کر لئے اور فلسفہ وسائنس کا فرق بھی جو اس وقت تک اچھے اچھے پڑھے لکھوں پر پوشیدہ تھا، اور اس کی وجہ سے اکثر خلطِ مبحث کرتے تھے، ان پر منکشف ہو گیا، یہ رسالہ ان کے مطالعہ (مذہب وعقلیات) کا نچوڑ اور ان کے ذہن کی صفائی اور دراکی کا اعلی نمونہ ہے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے اس کو پڑھ کر برجستہ فرمایا کہ ''یہ مذہب کا آہنی قلعہ ہے'' مختلف بزرگان دین اور اہل دل کی صحبتوں نے ان کی فکر کی جولانیوں میں انوار الٰہی کے دریا بہا دیئے، ان کے نوک قلم سے نکلنے والے خیالات نے سعادتوں کی چادر قارئین کے دل ودماغ پر پھیلا دیں اور اہل دل کی مجلسوں اور ان کے ملفوظات سے روحانی استفادہ کر کے ان کی زندگیوں میں اصلاحی انقلابات پیدا کر دیئے۔(۲)

مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا اشرف علی تھانوی کی صحبتوں نے ان کے قدیم وجدید کے فلسفیانہ نظریات میں ایسے روحانی اعتدال کا میزان مقرر کیا جس کی جھلک ہمیں

ان کے قرآنی درسیات میں جا بجا نظر آتی ہے، وہ ایک طرف علوم دینیہ کے ماہر اسلامیات نظر آتے ہیں تو دوسری طرف روحانیت کے ترجمان، وہ ایک طرف فلسفہ وسائنس کے مشاق تو دوسری طرف اسلام کے داعی اور شارح شریعت، وہ حقیقت میں ندوۃ العلماء کے مثالی ترجمان ہیں جس میں قدیم نافع اور جدید صالح کا سنگم نمایاں نظر آتا ہے۔

مولانا عبد الباری صاحب ندوی بنام مولانا عمران خان صاحب ندوی کے درمیان مکاتیب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں شخصیات نے اپنے عہد کے حالات اور مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں اپنی قوت فکر و عمل کے ذریعہ سے تعمیری نتائج اخذ کرنے میں کیا کیا کاوشیں انجام دیں، ان کی باہمی مشاورت، منصوبہ بندی، قوت فیصلہ، استقلال اور زمانہ کی نبض شناسی، اداروں کی تنظیم واصلاح اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں ان کا لازوال مثالی کردار نمایاں نظر آتا ہے۔

ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ۲۰۱۴ء میں مولانا محمد عمران خان ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیر سوسائٹی کے ماتحت سوسائٹی کے صدر قبلہ والد صاحب مولانا پروفیسر محمد حسان خان اور دارالمصنفین کے دیرینہ رفیق مولانا عمیر الصدیق ندوی کی کوششوں سے ایک کتاب منظر عام پر آئی ہے جس کا نام ''مکاتیب مشاہیر ندوۃ العلماء بنام مولانا محمد عمران خان ندوی ازہری'' ہے اس میں مولانا عبد الباری صاحب ندوی کے بارہ خطوط بھی شائع ہوئے ہیں جن کا تعلق ندوۃ العلماء اور ندوہ کی شوری کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کی فکروں سے ہے اور وہ خطوط ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک ہیں اور صرف ایک خط کافی وقفہ کے بعد ۱۹۶۲ء کا ہے اور اس وقت جد محترم حضرت مولانا محمد عمران خان صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم تھے اور مولانا عبد الباری صاحب کی اولاد ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کر رہی تھی اور مولانا خود حیدرآباد اپنی ملازمت کی وجہ سے منتقل ہو گئے تھے، لہذا انہوں نے اپنی اولاد کا سرپرست جد محترم کو بنایا اور مستقل اس کی فکر رکھتے، کئی خطوط میں اس کا تذکرہ ہے۔

مولانا عبد الباری ندوی کے مکتوبات کے مطالعہ سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ مولانا

ندوی مولانا عمران خان صاحب سے ذاتی محبت وانسیت رکھتے تھے اور اپنے نجی معاملات میں خان صاحب سے بلاتکلف مشورہ کرتے اور فیصلے لیتے تھے، مولانا عبدالباری ندوی کے حیدرآباد کے قیام کے دوران ان کے بچے ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم تھے، ندوہ میں خان صاحب کا گھران کے بچوں کی تربیت گاہ تھا ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں خان صاحب پر بھرپور اعتماد کیا اور اس طرف سے بالکل مطمئن ہوگئے۔

اسی سلسلہ میں اپنے ایک طویل مکتوب مؤرخہ ۲۸؍جولائی ۱۹۴۲ء میں رقم طراز ہیں:

''صبیحہ سلمہا کے متعلق کیا عرض کروں؟ میں تو آپ کی عنایت کو بالکل غیبی اعانت سمجھتا ہوں اور ہر طرح مطمئن ہوں کہ اس سے بڑھ کر کیا صورت ہوسکتی ہے''۔(۳)

اپنے خط مؤرخہ ۲۰؍فروری ۱۹۴۴ء میں لکھتے ہیں:

''بچوں کی رپورٹ پڑھی شمسو سلمہ (شمس الباری ندوی) کی متعلق خصوصیت سے متفکر ہوں اگر آپ کی توجہ کا تجربہ بھی خدانا خواستہ ناکام ہوا تو میری دشواری بہت بڑھ جائے گی وہ بدفہم بالکل نہیں معلوم ہوتا کسی وجہ سے جی نہیں لگاتا اور توجہ نہیں کرتا اس کا علاج نفسیاتی اور مختلف قسم کی ترغیب وتشویق ہی سے ہوسکتا ہے، ترہیب اور مار پیٹ سے یہ مرض بڑھتا ہے''، وہ آگے لکھتے ہیں:
''بعض اساتذہ کو بچوں کی تعلیم کا فطری ڈھنگ بھی ہوتا ہے، کاش کوئی ایسا ہی ٹیوٹر شمسو سلمہ کے لئے مل جائے ورنہ مجھ کو اس کی ابتداء کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے جس کی اصلاح پھر دشوار کیا ناممکن ہوگی''۔(۴)

مندرجہ بالا عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں کتنے حساس اور ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے کتنے باخبر و بیدار مغز تھے۔

وہ آگے لکھتے ہیں:

''بچوں کی تربیت میں نفسیاتی تدابیر کا زیادہ لحاظ ہے کہ بچوں کے ذہن

میں یہ بات نہ جم جائے کہ وہ سب کی نگاہ میں برے ہی برے ہیں ورنہ پھر انہیں بھلا بنانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے"(۵)

مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی زندگی میں ڈسپلن، وقت کی پابندی اور قانون کی حکمرانی اولین ترجیحات میں شامل تھیں، ندوۃ العلماء کے کسی انتظامی فیصلہ سے متعلق ایک خط مؤرخہ ۶ رجون ۱۹۴۴ء میں رقم طراز ہیں:

"جو شخص کسی ادارہ سے وابستہ ہوکر وفاداری وفرض شناسی کے حقوق نہ ادا کرتا ہو، نہ تفہیم وتنبیہ سے اثر لیتا ہو اس کی ادارہ کی جانب سے کسی طرح کی اعانت ادارہ کے ساتھ خیانت خیال کرتا ہوں، ایسے شخص کا علیحدہ ہوجانا یا کردینا ہی دیانت ہے، کسی کو زیادہ ہمدردی ہو تو اپنی ذات سے کرسکتا ہے"۔(۶)

مولانا عبدالباری صاحب مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا اشرف علی تھانوی سے روحانی طور پر مستفیض ہوچکے تھے اور اسلام میں تصوف کی اہمیت اور افادیت کے معترف تھے وہ اپنے ایک مکتوب مؤرخہ ۱۴رجون ۱۹۴۴ء میں خان صاحب کو لکھتے ہیں:

"یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ بھوپال میں کسی بزرگ کی خدمت سے مستفیض ہوتے رہتے ہیں، دین کے رسوخ کے لئے صحبت ہی بڑی دولت ہے اگر دین کی صحیح فہم اور اس پر عمل کی توفیق نصیب ہو تو مؤمن کی ساری دنیا صرف بظاہر دنیا ہوتی ہے ورنہ صرف عین دین"۔(۷)

مولانا کے مکتوبات میں زبان سہل، عام فہم، سلاست وروانی سے مزین اور منضبط جملوں وعبارات سے سجی سجائی ہوتی تھی جس میں بے تکلفی وبرجستگی نمایاں نظر آتی ہے اور پڑھنے والا مسحور ہوجاتا ہے۔

حواشی:

۱- پرانے چراغ جلد دوم از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، ص ۱۱۸

۲- پرانے چراغ جلد دوم از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، ص ۱۱۷-۱۱۸

۳- مکاتیب مشاہیر ندوۃ العلماء بنام مولانا محمد عمران خان ندوی ازہریؒ از پروفیسر محمد حسان خان وعمیر الصدیق ندوی، ص ۴۶

۴- مکاتیب مشاہیر ندوۃ العلماء بنام مولانا محمد عمران خان ندوی ازہریؒ از پروفیسر محمد حسان خان وعمیر الصدیق ندوی، ص ۵۰

۵- مکاتیب مشاہیر ندوۃ العلماء بنام مولانا محمد عمران خان ندوی ازہریؒ از پروفیسر محمد حسان خان وعمیر الصدیق ندوی، ص ۵۲

۶- مکاتیب مشاہیر ندوۃ العلماء بنام مولانا محمد عمران خان ندوی ازہریؒ از پروفیسر محمد حسان خان وعمیر الصدیق ندوی، ص ۵۴

۷- مکاتیب مشاہیر ندوۃ العلماء بنام مولانا محمد عمران خان ندوی ازہریؒ از پروفیسر محمد حسان خان وعمیر الصدیق ندوی، ص ۵۷

باب سوم

تصنیفات وافکار

مولانا عبدالباری ندوی

اوران کا سلسلۂ تجدید

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی (۱)

الحمدللہ رب العالمین، والصلاة والسلام علی رسوله الأمین سیدنا محمد، وآله وأصحابه اجمعین.

راقم آثم پر اللہ تعالیٰ کے بیشمار انعامات میں سے ایک بڑا انعام یہ بھی ہے کہ اُس نے اِسے بہت سے علماء کبار، اتقیاء، ابرار نیز ممتاز ترین محققین سے ملاقات؛ بلکہ استفادہ کا شرف بخشا، فالحمدللہ علی ذلک۔ ان میں سب سے نمایاں شخصیت استاذ معظم شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، فقید النظیر واعظ شیریں بیاں، متکلم اسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، محدث جلیل، مرشد عظیم مصنف کبیر حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ قدس اللہ اسرارہم ہیں۔ ان سبھی سے راقم کو شرف تلمذ بھی حاصل ہے، (ظاہر ہے کہ یہاں استیعاب مقصود نہیں، بلکہ صرف چند نمایاں واہم حضرات کا ذکر کیا جاتا ہے) اول الذکر سے ''بخاری شریف'' جلد اول کا (دارالعلوم دیوبند میں ان کے انتقال کے سال) تقریباً تین چار ہفتے باقاعدہ درس لیا اور ثانی الذکر سے علم وحکمت سے مملو عظیم وجلیل کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں کئی مہینہ استفادہ کیا۔ آخر الذکر سے ''بخاری شریف'' کے ایک دو سبق میں شرکت کی، یاد آتا ہے کہ ان میں سے ایک حدیث ''ضمام بن ثعلبہ'' کی تھی، حضرتؒ نے اس کی ایسی عام فہم اور دلنشیں تشریح فرمائی کہ آج تک جبکہ تقریباً نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کی

---

(۱) سابق صدر شعبۂ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

لذت فراموش نہیں ہوئی۔ نیز حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مشہور رسالہ ''مجموعۃ المسلسلات'' (۱) کا بتمامہ سماع کیا۔

اس کے کافی مدت بعد (دسمبر ۱۹۷۰ء) مخدوم ومحترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی دعوت پر تدریس وتحقیق کے لیے جب دارالعلوم ندوۃ العلماء آنا ہوا تو حضرت موصوف سے بھرپور علمی استفادہ اوران کی گونا گوں شفقتوں سے مالامال ہونے کا موقع ملا، نیز یہاں آنے کے بعد ہی مشہور مفسر ومبصر حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ مدیر ''صدق جدید'' سے تعارف ہوا، اور موصوف نے اپنی خوردنوازی کی بناپر راقم کے بعض مضامین پر ''صدق جدید'' میں متعدد بار توصیفی وحوصلہ افزا کلمات لکھ کر شائع فرمائے، ان کے علاوہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ابتدائی دور کے ممتاز ترین فضلاء میں سے ایک مشہور فلسفی عالم ومصنف، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے دست گرفتہ اور مجاز بیعت، ان کی محبت وعظمت میں مستغرق اور موصوف کے علوم کوشائع وعام کرنے والے اور ''جامع المجد دین'' جیسی بیش قیمت تصانیف کے مصنف حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ سابق پروفیسر ''جامعہ عثمانیہ'' حیدرآباد سے بھی تقریباً پانچ سال تک ملاقات اور علمی گفتگو واستفادہ کے مواقع فراہم ہوئے۔ فالحمدللہ علی ذلک۔

جس کی تقریب یہ ہوئی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اس وقت کے شعبۂ حفظ کے ذمہ دار اور مشہور استاذِ حفظ حافظ محمد اقبال صاحب مرحوم (جوحسن اتفاق سے ہمارے ندوہ میں پڑوسی بھی تھے) کا مولانا موصوف سے گہرا ربط وتعلق تھا اور وہ برابران کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ راقم کوحضرت تھانویؒ اوران کے سلسلہ سے قدیمی ربط ہے، گویاان کی عظمت ومحبت گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، کیونکہ احقر کے والد ماجد مولانا قاری محمد حمیدالدین سنبھلیؒ نہ صرف حضرت تھانویؒ کے دست گرفتہ تھے؛ بلکہ ایک درجہ میں معتمد اور فنافی الشیخ کا مرتبہ رکھتے تھے۔

حافظ اقبالؒ مذکور کے ہمراہ راقم نے بھی مولانا عبدالباریؒ کے پاس جانا آنا شروع کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں موصوف کواحقر سے خاصی مناسبت ہوگئی؛ بلکہ ربط وتعلق پیدا ہوگیا، اسی لیے مولانا نے ''جامع المجد دین'' کا پوراسیٹ جس میں ''تجدید دین کامل''، ''تجدید تصوف

وسلوک''، ''تجدید تعلیم وتبلیغ''، ''تجدید معاشیات'' اپنے دست مبارک سے راقم کا نام لکھ کر اپنے دستخط کر کے عنایت فرمایا، فجزاہ اللہ خیرالجزاء۔ اور متعدد بار دعوت طعام پر یاد کیا، حتی کہ اخیر میں اتنا تعلق بڑھا کہ راقم کے لیے بعض کاموں کی وصیت بھی فرمائی، اسی بنا پر اس وقت سے لے کر آج تک مولانا موصوف کے صاحبزادگان بالخصوص بھائی احمد الباری و فضل الباری صاحبان زید کرمہما، نیز دیگر اقارب سے عزیزانہ ربط وتعلق ہے۔

جیسا کہ اوپر کی سطروں سے معلوم ہوا کہ مولانا موصوف نے حضرت حکیم الامت کو مجدد ہی نہیں؛ جامع المجددین فرمایا اور اس کے ثبوت یا اثبات میں ایک نہیں چار چار جلدوں پر مشتمل (کئی کئی سو صفحات کی) کتابیں تصنیف فرمائی، ان میں اپنے اس نظریہ کے دلائل وشواہد بھرپور فراہم کیے، اس میں سب سے اہم بات حضرت سید الطائفہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا بیش قیمت علمی وتحقیقی مقدمہ شامل کیا، جس کے اندر سید صاحب موصوف نے بہت ہی عالمانہ ومحققانہ انداز میں منصب تجدید پر گفتگو کرتے ہوئے واضح کیا کہ کسی کا مجدد ہونا ایسا یقینی نہیں ہوتا کہ اس کے مجدد ہونے پر نبی کے نبی ہونے پر ایمان لانے کی طرح یقین کرنا ضروری ہو؛ بلکہ کسی کا مجدد ہونا تخمینی اور قرائن کی بنیاد پر محض ظنی ہوتا ہے اور ''سنن ابی داؤد'' کی یہ مشہور حدیث "إن اللّٰه يبعث في أمتي على رأس كل مائة من يجدد لها دينها" نقل فرما کر اس کی بڑی عالمانہ تشریح فرمائی اور بجا طور پر یہ بھی کہا کہ مجدد کا ایک وقت میں ایک ہونا ضروری نہیں کیونکہ حدیث شریف کا تقاضا ہے کہ مجدد کا ایک وقت کے اندر فرد واحد میں منحصر ہونا لازمی نہیں؛ بلکہ متعدد بھی ہو سکتے ہیں، چنانچہ اسی کے ساتھ سید صاحب نے پہلی صدی کے متفق علیہ مجدد حضرت عمر بن عبدالعزیز سے لے کر حال تک مجددین کی ایک فہرست بھی پیش کی ہے، ان میں ایک وقت میں ایک سے زیادہ مجددوں کے نام بھی ملتے ہیں۔

علم وتعلیم

مولانا نے حضرت تھانویؒ کے مجدد ہونے کے قرائن وشواہد ذکر کرتے ہوئے ان کی تحریروں سے جا بجا بکثرت طویل ومختصر اقتباسات (یا ان کا مفہوم وخلاصہ) پیش کیے

ہیں، چنانچہ تعلیم وعلم کے بارے میں لکھا ہے ''تعلیم کے صحیح معنی متعلم کو اس کے مقصد وجود کی تحصیل و تکمیل کا علم عطا کرنا ہے، لیکن تعلیم جدید نے انسان کو اپنے اور کائنات کے وجود کا جو علم وتصور عطا کیا ہے، وہ یہ ہے کہ سارا کارخانہ عالم بس ایک خودرو جنگل ہے، جس کا کوئی باغبان نہیں.....اس تصور کی منطق کا لازمی نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ دوسرے جانوروں کی طرح یہ بھی زندگی کی ساری تگ ودو اور کشمکش کھانے پینے، رہنے سہنے کی نذر کردے.......نہ مستقبل میں اس کی موجودہ زندگی کا کوئی حساب وکتاب یا جزاوسزا، تو اس کا ثمرہ اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے کہ وہ آغاز وانجام سے یکسر بے پرواہ ہو''۔ (تجدید تعلیم وتبلیغ، صفحہ ۲-۳)

........لیکن اس کے برخلاف اسلام کے تصور میں انسان نہ نرا اعلیٰ درجہ کا حیوان ہے اور نہ اسلام کا تعلیمی تصور اس کی عارضی وضمنی حیوانیت کو ترقی دیتا ہے، انسان انسان ہے اور اس کی تعلیم کا مقصد اس کو انسان کامل بنانا ہے......اور اس کی فانی ومحدود زندگی کا دامن ایک غیر فانی وغیر محدود ذات وانجام سے بندھا ہوا ہے........اور تعلیم کا مقصد دنیاوی زندگی کو خیر بنانا ہے، نہ کہ انجام ومنزل سے آنکھیں بند کر کے خود راستہ ہی کو منزل بنالینا۔ (تجدید تعلیم وتبلیغ ص:۱۰۶)

ظاہر ہے کہ علم وتعلیم کے ان دونوں نقطہائے نظر میں زمین وآسمان کا سافرق ہے، اس لیے پہلے نقطہ نظر کو اپنانے والے بس حیوان یا بہت سے بہت ترقی یافتہ حیوان بنتے ہیں اور دوسرے کو اختیار کرنے والے انسان کامل ہوتے ہیں جس کا مرتبہ فرشتوں سے بھی اونچا ہے۔

معاشیات اور کسب معاش

جیسا بنیادی فرق اسلامی نقطہ نظر سے علم وتعلیم اور دنیاوی علم وتعلیم کے بارے میں اوپر بیان کیا گیا ویسا ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ فرق کسب معاش اور معاشیات کے درمیان اسلامی اور غیر اسلامی نقطہ نظر میں ہے، دنیاوی نظر سے کسب معاش کا حاصل یعنی لادینی معاشیات کی منطق کا خلاصہ یہ ہے کہ کھانا جینے کے لئے اور جینا پھر کھانے یا معاشی فکر میں کھپے رہنے کے لیے، اس کے برخلاف اسلامی نقطہ نظر یہ ہے کہ کھانا پینا اور دوسری جسمانی

اور دنیاوی ضرورتیں جائز طریقہ سے پوری کی جائیں اور ان کا مقصد بھی دینی احکام کی تکمیل ہو، محض شکم پوری اور شہوت رانی نہ ہو، مولانا کے الفاظ میں:۔

> اسلام کسب معاش یا طلب مال کی اجازت اس لیے دیتا ہے کہ اس سے زندگی کی حفاظت ہو اور وہ زندگی خدا طلبی میں لگائی جائے، بخلاف اس کے لادینی معاشیات کی منطق کا خلاصہ یہ ہے کہ کھانا جینے کے لیے اور جینا پھر کھانے یا معاشی فکر میں کھپے رہنے کے لیے۔ (تجدید معاشیات، ص:۲۱۵)

حضرت حکیم الامتؒ کے مذکورہ بالا افادات نقل کرنے کے ساتھ مولانا نے تصوف واخلاقیات کے بارے میں بلکہ دوسرے تمام اسلامی شعبوں کے متعلق مفصل اور کہیں مختصر تعلیمات نقل کر کے ثابت کر دیا ہے کہ حضرت حکیم الامتؒ مجدد کامل تھے اور ان کے بیان فرمودہ ارشادات پر عمل کر کے ہر شخص انسان کامل بن سکتا اور دنیا و آخرت سنوار سکتا ہے۔

طوالت کے خوف سے مزید اقتباسات یہاں نقل نہیں کیے جا رہے ہیں؛ بلکہ اسی پر اکتفا کیا جا رہا ہے، لیکن اخیر میں یہ کہے بغیر رہنا حق پوشی ہوگی کہ حضرت حکیم الامت کو چاہے اور شعبوں میں اہل حق نے مجدد مانا ہو یا نہ مانا ہو، مگر تقریباً تمام صحیح الفکر، سلیم القلب علماء نے یا ان کی بڑی اکثریت نے تصوف میں مجدد ضرور مانا ہے(۱)، واقعہ یہ ہے کہ حضرت کی تصوف پر تعلیمات وتصنیفات (مثلاً ''تربیۃ السالک'' وغیرہ نیز ترجمہ وتفسیر قرآن کریم) کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر منصف مزاج، ذی علم، صاحب فکرِ سلیم اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ حضرت حکیم الامتؒ اس میدان میں مجدد و مجتہد تھے۔ وما ذلك على الله بعزيز فرحمهم الله رحمة واسعة وأسكنهم فی جنات النعيم.

حواشی:

(۱) مجموعۃ المسلسلات والدر الثمین والنوادر

(۱) چنانچہ ایک موقع پر جہاں بہت سے اہل علم موجود تھے اور اس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی تو محدث اعظم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمیؒ نے تقریباً یہی بات ارشاد فرمائی تھی۔

مولانا عبدالباری ندویؒ کی تصنیف
"تجدید معاشیات"-ایک تعارفی مطالعہ

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی (۱)

مولانا عبدالباری ندویؒ (۱۸۹۰-۱۹۷۶ء) ندوۃ العلماء کے ان ممتاز فضلاء میں سے تھے جنھیں اسلامی و مشرقی علوم میں مہارت کے ساتھ عصری علوم سے بھی بخوبی واقفیت تھی اور جنھوں نے اپنی تصانیف میں اسلامی و عصری علوم میں امتزاج کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ مولانا مرحوم کی علمی مصروفیات گوناگوں رہی ہیں۔ انھوں نے مختلف تعلیمی اداروں اور جامعات میں درس و تدریس کے ساتھ ترجمہ اور تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا اور جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کیا اور مدلل انداز میں اپنے نتائجِ فکر پیش کیے۔ زیر مطالعہ کتاب (تجدید معاشیات) بھی ان خصوصیات کی حامل ہے۔ اسلامی معاشیات کا موضوع بہت اہم ہے۔ برصغیر ہندو پاک کے متعدد علماء و اس کالرس اس پر مقالات و کتابیں تصنیف کرتے رہے ہیں۔ اردو میں اس موضوع پر اولین محققین و مصنفین میں مولانا عبدالباریؒ کے علاوہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور جناب محمد یوسف الدینؒ شامل ہیں جن کی کتابوں کے نام بالترتیب یہ ہیں: اسلامی معاشیات، اسلام کے معاشی نظریے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ ان تینوں اس کالرس کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے حیدرآباد سے رہا ہے۔ امام ابو یوسف کی وقیع تصنیف "کتاب الخراج" اسلامی معاشیات کے ایک بہت اہم پہلو سے تعلق رکھتی ہے جدید دور میں اسلامی معاشیات کے ممتاز اس کالر پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی نے اس موضوع

---

(۱) سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

پر اپنی مستقل بیش بہا تصانیف کی اشاعت سے بہت قبل کتاب الخراج کو اردو میں ("اسلام کا نظامِ محاصل"(۱) کے عنوان سے) منتقل کر کے اسلامی معاشیات پر اردو لٹریچر میں ایک قیمتی اضافہ کر دیا تھا۔ زیرِ مطالعہ کتاب دراصل مولانا کے سلسلۂ تجدید (جامع المجدد دین، تجدید تصوف وسلوک، تجدید تعلیم و تبلیغ) کی آخری کڑی ہے، جو پہلی بار تنویر پریس، امین آباد، لکھنؤ سے ۱۹۵۵ء میں طبع ہوئی۔ پیش نظر مقالہ کے لیے اس کتاب کا مطالعہ اس ایڈیشن (جو مولانا مرحوم کا ہدیہ کردہ ہے) کے مشتملات کے مطابق ہے۔

کتاب کی طباعت سے قبل مولف گرامی کی فرمائش پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس پر نظر ثانی فرمائی تھی۔ اس کے تمہیدی ابواب پہلے ماہنامہ "الفرقان" میں شایع ہوئے تھے۔ یہ کتاب جناب حفیظ الرحمٰن صاحبزادہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے زیر اہتمام طبع ہوئی۔(۲)

زیرِ مطالعہ کتاب کی معنوی اہمیت کا اندازہ مصنفِ گرامی کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ "سلسلہ تجدید سے متعلق مستقل تالیفات کی اصل تجویز میں چوتھی آخری کتاب "تجدید سیاسیات" تھی لیکن یکایک خیال آیا کہ انقلاب روس کے بعد سے دین کے حق میں معاشیات کا فتنہ سیاسیات سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہو رہا ہے بلکہ خود سیاسیات معاشی نعروں کا ضمیمہ بن کر رہ گئی ہے اس لیے تجدید کے صلاحی واصلاحی مقصد کے مدنظر معاشیات کا معاملہ اہم واقدم ہو گیا ہے" (۳) ۵۱۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب سات ابواب میں منقسم ہے، جس کے عناوین اس طور پر ہیں: (۱) معاشیاتِ عبدیت (۲) معاشیاتِ مشیت (۳) معاشیاتِ عبثیت یا معاشیات جدیدہ (۴) معاشیاتِ انفاق (۵) معاشیاتِ ایمان (۶) معاشی مسائل اور مشکلات کا اسلامی حل (۷) لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔

اس کتاب کے مآخذ کے تعلق سے اہم بات یہ ہے کہ مولانا نے قرآن کریم کو اولین واہم ترین ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ سیرت نبوی ﷺ اور حیاۃ صحابہ کرامؓ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اپنے مربی گرامی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتابوں سے جا بجا اقتباسات نقل کیے ہیں۔ ان سب کے علاوہ حالات حاضرہ اور اپنے تجربات سے استفادہ

کر کے کتاب کے مباحث کواور زیادہ مفید بنادیا ہے۔ زیادہ تر حوالے متن کے اندر مندرج ہیں اور بہت سے حواشی یا فُٹ نوٹس کی صورت میں بھی ملتے ہیں۔ مآخذ سے استفادہ کے سلسلہ میں اس کتاب میں اور دوسری تالیفات میں مصنفِ محترم کا جو منہج رہا ہے اسے خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:۔

> بس فہم قرآن سے کچھ ٹوٹی پھوٹی مناسبت البتہ اللہ تعالیٰ نے بخش رکھی ہے، جب بھی کوئی خاص علمی و دینی ہی نہیں عملی و دنیوی مشکل بھی پیش آتی ہے تو أرنا الحق حقا کی دعا کے ساتھ راہِ حق پہلے براہ راست کلام حق ہی میں تلاش کرتا ہوں اور الحمدللہ اکثر کامل شرحِ صدر کے ساتھ دیر سویر مل جاتی ہے۔ پھر اسی سہارے تکمیلِ مدعا کی غرض سے دینی و علمی معلومات کچھ اور فراہم کر لیے جاتے ہیں۔ خصوصاً اگر حضرت مجدد وقت حکیم الامت علیہ الرحمۃ کی بھی کوئی تحقیق اس باب میں ہاتھ آجاتی ہے تو شفائے تام کے لیے سونے پر سہاگہ ہوجاتا ہے۔ (۴)

کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ صحیح معنوں میں اسی وقت ہوسکتا ہے جب اس کے تمام مباحث کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے۔ اس مقالہ میں کتاب سے چند منتخب ابواب کا مطالعہ ہی مقصود ہے۔ اس سے کتاب کی نوعیت، اس کے مضامین کی اہمیت اور منہج و نتائجِ بحث کو سمجھنے میں کسی حد تک مدد ملے گی۔

مصنفِ ممدوح نے کتاب کے دیباچہ میں اسلامی معاشیات کا یہ امتیازی نکتہ واضح کر دیا کہ اس کی بنیاد "کسب معاش یا پیدائش دولت کے بجائے استعمالِ دولت یا انفاق پر ہے اور یہی تمام معاشی مسائل و مشکلات کا اصولی و قرآنی بے خطا اسلامی حل ہے"۔ (۵) حقیقت یہ کہ قرآن کریم کے مطالعہ سے ناچیز کے سامنے بھی یہی نکتہ ابھر کر سامنے آتا ہے، اس لیے کہ زیادہ زور انفاق یا مال کو خرچ کرنے اور اس میں سے دوسروں کے حقوق ادا کرنے پر دیا گیا ہے۔ مولانا نے اسلامی معاشیات کے اسی بنیادی نکتہ کو مختلف ابواب میں نمایاں کیا ہے اور خاص طور

سے چوتھے باب میں اس پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔

معاش، معاشیات یا معاشی سرگرمیوں کے بارے میں مولانا مرحوم نے سب سے پہلے اسلام کا یہ اصولی نقطہ نظر واضح کیا کہ یہ وسائل و ذرائع ہیں، مقاصد نہیں۔ معاشی فلاح و فراخی کا مقصد بس اتنا ہوتا ہے کہ آدمی کی مادی زندگی کی ضرورتیں سہولت و راحت کے ساتھ پوری ہوتی رہیں۔ دوسرے لفظوں میں معاشی مسائل اور اس راہ کی ساری تگ و دو کا تعلق گھوم پھر کر جسمانی یا حیوانی زندگی کے بقا و تحفظ یا آرام و آسائش سے ہے۔ یعنی یہ زندگی کے وسائل ہیں مقاصد نہیں۔ اس لیے انھیں اسی حیثیت سے برتنا چاہیے۔ مولانا کی نظر میں یہی تصور یا اپروچ اسلامی اور غیر اسلامی معاشیات میں حدِّ فاصل ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

> دنیوی معاشیات و سیاسیات کیا، اسلام کی نگاہ میں جب یہ دنیا اور اس کی زندگی خود ہی سرے سے مقصود نہیں بلکہ ایک بے انتہا وسیع و نامحدود زندگی کا محض راستہ ہے، تو راستہ کے ساتھ وہ منزل کا معاملہ کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ بس یہی وہ دوراہہ ہے جہاں سے اسلامی یا دینی اور لادینی معاشیات و سیاسیات، سب کی راہیں پھٹ کر بالکل الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ (۶)

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مصنف گرامی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سرائے کے ساتھ وطن، راستہ کے ساتھ منزل، وسیلہ کے ساتھ مقصد کا برتاؤ کرنا دانشمندی نہیں، حماقت ہے اور جانی و مالی اور جسمانی و ذہنی توانائیوں کا ضیاع ہے۔ (۷)

انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مولانا کے افکار کا سب سے قیمتی عنصر یہ ہے کہ ہر حال میں (خواہ معاشی زندگی ہو یا کوئی اور) اصل مطلوب مومن صالح بننا ہے۔ ان کی نظر میں تو معاشیات کی اہمیت سے انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ جائز ذرائع سے حصولِ معاش کی جدوجہد کے مطلوب و محمود ہونے میں کوئی کلام ہو سکتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مسلمان کا مسلمان ہونے کی حیثیت سے معاشی خوش حالی سے پہلے اور بعد جہاں اور جس حال میں بھی ہو مقدم کام انفرادی و اجتماعی ہر لحاظ سے بقدر استطاعت ''مومن صالح'' بننا اور بنانا ہے۔

لہٰذا معاشی فراخی وخوشحالی کے ساتھ دین کی فکری وعملی نمائندگی نہیں تو قرآنی نقطۂ نظر سے یہ قابل قبول نہیں اور اگر افلاس وغربت کے ساتھ ایمان، حسن عمل اور فکر آخرت کی زندگی ہے تو یہ بہتر اور قابل ترجیح ہے۔(۸) اسی ضمن میں مولانا نے یہ مزید وضاحت فرمائی کہ دین اسلام کا خاصہ انسان کو انسانیت کے اعلیٰ مقام پر پہونچانا ہے اور یہ تونگری کی صورت میں ہوسکتا ہے اور فقیری میں بھی۔ یعنی اخروی زندگی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب جس طرح مالی وسعت اور سیاسی قوت کے ساتھ حاصل ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح تنگ دستی اور محکومی کی حالت میں بھی۔ مولانا کی رائے میں اسلامی معاشیات کے برخلاف یورپ کی لائی ہوئی جدید معاشیات بالکلیہ آخرت فراموشی بلکہ آخرت بیزاری پرمبنی ہے، اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔(۹)

معاش کا معاملہ اور اس سے نپٹنا انسان کے لیے ناگزیر ہے، لیکن اس کے حصول یا اس کے حل کی راہ میں انسان کن کن آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے اور کہاں کہاں ٹھوکر کھاتا ہے اس پر مصنفِ محترم نے بہت چبھتا ہوا تبصرہ فرمایا ہے۔ خود ان کے الفاظ میں:۔

> انسان کے حیوانی و مادی خمیر کا سب سے کمزور پہلو قدرتاً اس کے پیٹ یا معاش کا معاملہ ہے۔ اصول، اخلاق، علم و ہنر، عزت و شرافت، غیرت و حمیت، مروت و محبت، غرض انسانیت کے ہر چھوٹے بڑے جوہر کو بھینٹ چڑھا دینے کے لیے اس کمزوری کو آمادہ کرلیا جاتا ہے۔(۱۰)

کتاب کا باب اول (معاشیاتِ عبدیت) درحقیقت سورہ الذاریات کے آخری حصہ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ. إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ (الذاریات:۵۸) کی تشریح وتوضیح ہے۔ اس آیت کی روشنی میں اسلامی معاشیات کے بنیادی اصول کو واضح کرتے ہوئے مولانا مرحوم نے یہ خیال ظاہر کیا کہ انسان کی زندگی کا مقصد عبادت یا عبدیت ہے۔ یعنی بندہ اس طرح اپنے آپ کو اپنے مالک ورب کے حوالہ کردے کہ اس کی مرضی ومشیت کے ساتھ پورا پورا توافق ہوجائے، رب کی مرضی اس کی مرضی بن جائے اور خود اسلام کے معنی

یہی ہیں یعنی اللہ کے سامنے سرافگندگی اور مکمل سپردگی۔ مولانا تھانویؒ کے ایک وعظ کے حوالہ سے اس تصور کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

غرض جو شان غلام کی ہوتی ہے وہی انسان کی ہے۔ عبد شدن کے لیے انسان ہی ہے۔ انسان کسی خاص حالت اور خاص کام کو اپنے لیے تجویز نہیں کرسکتا بلکہ حضرتِ حق جس حال میں رکھیں اسی میں اس کو رہنا چاہیے۔ کملی اوڑھائیں تو کملی اوڑھے۔ دوشالہ اڑھائیں تو دوشالہ اوڑھے۔ بھوکا رکھیں تو بھوکا رہے۔ گھی دودھ کھلائیں تو گھی دودھ کھائے''۔(۱۱)

اس تصور یا فکر سے کسی کو یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ معاش کے لیے جدوجہد یا کوئی تدبیر اختیار کرنا قرآن کی نظر میں مطلوب نہیں ہے۔ اس لیے مولانا نے صاف لفظوں میں یہ وضاحت فرمائی کہ ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ رزق و معاش کی اسبابی فکر و تدبیر ترک کردے، اپاہجوں کی طرح ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جائے اور خود سے فاقہ کو دعوت دے یا آسمان سے خوان اترنے کا انتظار کرنے لگے۔ نہیں بلکہ کسب معاش کے لیے اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو استعمال کرنا اور اس کے ذرائع اختیار کرنا اسلام کی نگاہ میں عین مطلوب ہے، لیکن ایک شرط کے ساتھ اور وہ یہ کہ طلب رزق کی ساری تدبیروں و کوششوں میں صاحب امانت (حق تعالیٰ) کی مرضی و منشا کا بھی پورا پورا خیال رکھا جائے۔(۱۲)

اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:۔

ایک طرف اگر صنعت و حرفت، زراعت و تجارت، مزدوری و ملازمت وغیرہ معاشی اسباب میں ہمارے اختیار تکوینی کو آزادی بخشی گئی ہے تو دوسری طرف ان اسباب کی بعض صورتوں پر حرام و حلال، جائز و ناجائز کی کچھ تشریعی پابندیاں خود ہماری خلافتی و روحانی فطرت یا انسانیت کی ترقی و تکمیل کے لیے عاید کردی گئی ہیں۔(۱۳)

معاشی جدوجہد کی راہ میں شریعت کی ان پابندیوں کے بارے میں مولانا نے بجا

تبصرہ فرمایا ہے کہ معاشی زندگی میں عبدیت یا بندگی کا تقاضا یہی ہے کہ ان کو بلا چوں چراں گوارا کیا جائے۔ وہ بڑے پرسوز انداز میں تحریر فرماتے ہیں:۔

زندگی کی ہر شاہراہ کی طرح معاشی زندگی میں بھی ہماری شانِ عبدیت کا پہلا مطالبہ یہی ہے کہ اپنے رب یا رزاق کی ربوبیت اور رزاقیت پر بھروسہ کرتے ہوئے فقر وغنا کے نتائج سے بے پروا ہوکر اس کی طرف سے عطا کی ہوئی رزقی ومعاشی آزادیوں اور عائد کی ہوئی پابندیوں کو بے چوں وچرا قبول کرلیں۔ (۱۴)

محولہ بالا آیت کے دوسرے حصہ کے تعلق سے مولانا نے یہ واضح کیا کہ انسان کی تخلیق کا مقصد عبادت یا عبدیت قرار دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ تمھارے پیدا کرنے کی غرض رزق کے مسائل حل کرانا نہیں درحقیقت انسان کو رزق کی فکر سے بےفکر کردینا ہے جو زندگی ملنے کے بعد اس کی حفاظت و بقا کے لیے سب سے پہلے دامن گیر ہوجاتی ہے۔ یہ اسی لیے تاکہ زندگی کے اصل مقصد یعنی بندگی کی تحصیل و تکمیل میں یکسوئی رہے۔ رہا یہ سوال کہ اللہ نے معاش کی تدبیر اختیار کرنے کی نہ صرف اجازت بلکہ ترغیب دی ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے یہ واضح کیا کہ:۔

طلب وتدبیر کی جو کچھ اجازت یا حکم ہے وہ بھی اس لیے نہیں کہ رزق کا ملنا، نہ ملنا اس پر موقوف ہے بلکہ یہ بھی دراصل عبدیت (یا بندگی) کی تمرین و تربیت کی ایک تدبیر ہے کہ کون اپنی طلب وتدبیر کو بالذات حصول رزق میں موثر نہ جان کر اور بالکلیہ مشیت الٰہی پر مبنی مان کر جائز وناجائز، حلال وحرام کے قایم کیے ہوئے ربوبیتی حدود اللہ پر اپنی معاشی تدبیروں میں استوار رہتا ہے اور کون خود ان تدبیروں کا بندہ بن جاتا ہے۔ (۱۵)

اس باب کے آخری حصہ میں تحریکِ اشتراکیت (جو معاشی نابرابری مٹانے کی داعی ہے) پر سخت نقد کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ تحریک نہ صرف اسلامی معاشیات کے مخالف

ہے بلکہ عبدیت یا بندہ پروری کے مصالحِ خداوندی کے منافی ہے۔ حقیقت یہ کہ اللہ کی بندگی کا اقرار کرنے والوں کے یہاں تنگی وفراخی یا بسطی وقدری رزق کا معاملہ اللہ کی بندہ پروری کی مصلحتوں پرمبنی ہوتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ع

خواجہ خودروشِ بندہ پروری داند (۱۶)

کتاب کا دوسرا باب ''معاشیاتِ مشیت'' کے عنوان سے ہے۔ جس کے اہم ذیلی عناوین ہیں: توحید کا مطلب، توحیدِ مشیت، تدابیر کا درجہ، قانونِ مشیت اور معاشی تنگی وفراخی کا مقصود۔ اس باب میں بحث کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ دنیا کا سارا نظام (بشمول معاشی) پوری طرح مشیتِ الٰہی کے تابع ہے۔ مشیتِ الٰہی سے متعلق سورہ آل عمران کی مشہور آیت ۲۶/ ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ کے حوالے سے مصنف گرامی نے یہ واضح کیا کہ:۔

> کیسا پختہ قول وقرار لیا گیا ہے کہ جس طرح لیل ونہار، موت وحیات کے سارے طبعی قوانین یا تکوینی حوادث وواقعات تمام تر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہیں، اسی طرح ملک ورزق یا سیاست ومعیشت کے سارے الٹ پھیر یا انقلاب پر بھی بالکلیہ اللہ ہی کی مشیت فرماں روا ہے۔ (۱۷)

مولانا مرحوم نے توحیدِ مشیت کو نہایت موثر انداز میں واضح کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا کہ سیاست ومعیشت ہو یا زندگی کا کوئی اور معاملہ، انسان جو بھی اسباب وتدابیر اختیار کرتا ہے ان کے بارے میں مسلمان کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ وہ نتائج پیدا کرنے میں فی نفسہ قطعاً موثر نہیں ہیں، تاثیر کلی طور پر اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہوتی ہے۔ زندگی کے جملہ معاملات میں بناؤ وبگاڑ، ترقی وتنزلی، نفع وضرر، عطا ومنع، مصیبت ونعمت، رنج وراحت کے ظاہری اسباب بس ظاہری ہی ہوتے ہیں۔ حقیقی سبب صرف مسبب الاسباب کی مشیت وارادہ ہوتا ہے۔ (۱۸)

حقیقت یہ کہ انسان اپنی کھیتی باڑی، کھانے پینے یا دوسری ضروریات کے لیے جو اختیاری تدابیر اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنی کامیابی وناکامی میں علمائے معاشیات کے وضع کردہ قوانینِ معیشت کے نہیں بلکہ بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ مشیت کے تابع ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے بار بار بیان فرمایا ہے۔ سورہ واقعہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ، أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ، لَوْ نَشَاء لَجَعَلْنَاهُ حُطَاماً فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ، إِنَّا لَمُغْرَمُونَ، بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُون، أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاء الَّذِي تَشْرَبُونَ، أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ، لَوْ نَشَاء جَعَلْنَاهُ أُجَاجاً فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ، أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ، أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِؤُون﴾ (الواقعہ: ۶۳-۷۱)

(ذرا دیکھو تو سہی جو کچھ تم بوتے ہو اس کو تم اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے۔ اگر ہم چاہیں تو اس ساری پیداوار کو چور چور کر دیں، پھر تم اس طرح کی باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم تو بڑے تاوان (تباہی) میں آ گئے، بلکہ سرے سے خالی ہاتھ رہ گئے۔ اچھا پھر دیکھو کہ پانی جو تم پیتے ہو وہ بادل سے تم برساتے ہو یا ہم ہیں برسانے والے۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو بالکل ہی تلخ کر دیں تو تم لوگ شکر کیوں نہیں ادا کرتے۔ پھر دیکھو کہ آگ جو تم جلاتے ہو (اس میں جلنے والی لکڑی کا) درخت تم نے پیدا کیا یا ہم پیدا کرنے والے ہیں) (۱۹)

قانون مشیت کی ہمہ گیر تاثیر سے بحث کرتے ہوئے مولانا عبدالباریؒ نے یہ بھی واضح کیا کہ انسانی تدابیر ہی اگر ملکی وعمومی قحط وقلت یا شخصی وانفرادی افلاس وعسرت پر قابو پانے کے لیے کافی ہوتیں تو کون ملک یا فرد ہے جو اپنی والی کوئی تدبیر اٹھا رکھتا ہے۔ مگر نتیجہ ہمیشہ ایک ہی نکلتا رہتا ہے کہ ''لگ گیا تو تیر نہیں تو تکّا''، یعنی اگر کامیابی ہو گئی تو اپنی خوش تدبیری پر ناز ورنہ تفکہات کی کیا کمی۔ (۲۰)

زیر بحث مسئلہ میں مولانا کے نتائج فکر کا لب لباب یہ ہے کہ معاشیات کے باب میں قانونِ مشیت اصلاً دخیل و موثر ہے نہ کہ قانونِ معیشت۔ خود ان کے الفاظ میں:

''معاشی یا رزق کی کمی و زیادتی، تنگی و فراخی یا خود قرآن کی تعبیر میں ''بسط وقدر'' کا تعلق نہ معاشی اشیاء کے قوانینِ طبیعت سے ہے اور نہ انسانی تدبیروں کے تیروں یا انسان کے خانہ ساز قوانینِ معیشت سے، بلکہ اس کا دار و مدار تمام تر اللہ تعالیٰ کے دیدہ و دانستہ قانونِ مشیت پر ہے اور معاشی مشکلات کا حل قدرت والے خدا کے بنائے ہوئے قوانینِ معیشت میں ڈھونڈنا چاہیے نہ کہ بے بس بندوں کے بنائے ہوئے قانونِ معیشت میں''۔ (۲۱)

باب سوم معاشیاتِ جدیدہ یا معاشیات ''عبثیت'' سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں جدید معاشیات کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے اور اس علم کے ماہرین کے افکار و تصورات کا تنقیدی جائزہ لے کر ان کی کمزوریوں بالخصوص انسانیت کے لیے ان کی مضرتوں و تباہ کاریوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ مزید برآں مصنفِ گرامی نے جدید معاشی لٹریچر کے بارے میں اپنا ناقدانہ تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ اس باب میں ان کی بحث کا لب لباب یہ ہے کہ جن معاشی تصورات یا جن معاشی نظام کی بنیاد خدا فراموشی اور خود فراموشی پر ہے اس کے نفاذ میں انسانیت کے لیے بھلائی ہو ہی نہیں سکتی (۲۲)۔

تیسرے انھوں نے جدید معاشیات کی یہ خرابی بھی واضح کی کہ یہ اخلاقیات سے عاری ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ انسانی زندگی کے اس فلسفہ پر مبنی ہوتی ہے جس میں آخرت اور خالق و مالک کے سامنے جواب دہی کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا تو لازمی طور پر جانوروں کی طرح انسان کے معاشی محرکات کا سر چشمہ بھی خود غرضی، خواہش تناسل اور ادراکِ لذت کوشی بن جاتا ہے اس کے برعکس اسلامی تصور معاشیات کی حقیقت واضح کرتے ہوئے مولانا نے اس پر خاص زور دیا کہ یہ ایسے تصورِ حیات سے مرتبط ہوتی ہے جس کا ایک خاص مقصد ہے اور جس میں ہر انسانی سرگرمی (خواہ معاشرتی ہو، معاشی ہو یا سیاسی) کی غرض و غایت سب سے

بڑے مقصد تخلیق (اخروی زندگی کی فلاح کی طلب) سے منسلک ہوتی ہے۔(۲۳) اس نکتہ کو واضح کرنے کے لیے انہوں نے یہ آیت مع ترجمہ نقل کی:

"أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ. فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ" (المومنون:۲۳/۱۱۶-۱۱۵)

(کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو یوں ہی عبث (مہمل) پیدا کیا اور [اپنے پیدا کرنے والے یعنی] ہمارے پاس تم کو پلٹ کر آنا نہیں [کہ تمھارے پیدا کرنے کا کچھ نتیجہ نکلے]۔ اللہ تعالیٰ جو سراپا بادشاہِ حق ہے، اس کی شان [ایسی باطل کاری یا عبث کاری] سے قطعاً بلند ہے)۔

اور پھر اسلامی تصورِ معاشیات کی امتیازی حیثیت ان الفاظ میں واضح کی:

"اسلام کی نظر میں جب انسان نرا معاشی حیوان نہیں تو اسلام کی انسانی معاشیات کو بھی آج کل کی نری حیوانی معاشیات سے دور کا بھی کیا لگاؤ ہوسکتا ہے"۔(۲۴)

اس باب کے آخر میں مصنفِ محترم نے جدید دور کے ان مسلم اسکالرس پر نقد کیا ہے جو اسلامی معاشیات پر اپنے مباحث میں اسلام کی معاشی تعلیمات یا اسلامی معاشیات کا مقصد دنیوی زندگی کے معاشی مسائل کا حل قرار دیتے ہیں اور اس طرح بقول ان کے "اپنی آواز" حیوانی معاشیات" کی آوازوں میں اس طرح ملا دیتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی اصطلاحات کے نام کے سوا اسلامی روح بالکل نکل جاتی ہے"۔(۲۵) ان اسکالرس پر مولانا کا تبصرہ خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

"اچھے اچھے صاحبِ علم وصلاح آج کل کی خالص دنیوی اور غیر معادی معاشیات کی نقالی میں سینکڑوں صفحات اسلامی معاشیات کے نام وعنوان سے اس طرح لکھے چلے جاتے ہیں کہ گویا قرآن وحدیث کی ساری معاشی تعلیمات کا مدعا بھی لے دے کر بس اسی دنیوی زندگی کے معاشی مسائل ومشکلات کا حل ہے۲۶۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی بہت ساری آیتوں سے معلوم ہوتا

ہے کہ ''معاش کے معاملہ میں بھی اسلام کا اصل رخ معاد ہی کے ابتلائی و پرورشی مصالح کی طرف ہے۔ارشاد ہے:

أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ (الانفال:۸/۲۸)

یعنی تمھارے مال اور اولاد (سب درحقیقت) تمھاری آزمائش و امتحان کے لیے ہیں اور اسی امتحان میں کامیابی پر آخرت میں تم کو اللہ کے پاس بڑا اجر و انعام ملے گا''۔(۲۷)

باب چہارم (معاشیاتِ انفاق) اس اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے کہ صاحبِ کتاب کے خیال میں یہی اسلامی معاشیات کی اساس یا اس کا سب سے اہم اصول ہے۔اس لیے کہ اسلام میں مال کے کسب و حصول سے زیادہ انفاق پر زور دیا گیا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں کسبِ مال کی تعلیم و ترغیب کسی آیت میں نہیں ملتی، جگہ جگہ تعلیم یا تاکید انفاق کی ملتی ہے۔اس باب میں ان کا حاصلِ مطالعہ، قرآن انھی کے الفاظ میں ملاحظہ کریں:

''قرآن مجید کا مطالعہ کیا تو اول نظر میں ششدر رہ گیا کہ مال کے نفس کسب و حصول کی تعلیم و ترغیب کہنا چاہیے کہ ۳۰ پاروں والے قرآن کی ایک آیت میں بھی نہ ملی، لیکن جو کتاب معاشیات کی نہیں دراصل معادیات کی ہے، جب اس پر نظر گئی تو الحمد للہ معادی ہی نہیں معاشی صلاح و فساد کے بھی سب سے بڑے سرچشمہ کا عظیم انکشاف ہوا، (یعنی) اسلام نے اپنی معادی یا دینی حیثیت میں انسان سے مال و معاش کے نفس کسب و طلب کا دراصل کوئی مطالبہ ہی نہیں کیا ہے۔معاشی و رزقی ضمانت انسان کیا زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی پیدا کرنے والے نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِى الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا﴾ (ھود:۱۱/۶)(۲۸)

اسی بحث کے ضمن میں مولانا مرحوم نے اس بات پر خاص زور دیا کہ مال و زر کی اصلی و فطری غرض و غایت تو دین و دنیا کی صلاح و فلاح میں اس کا استعمال کرنا یا انفاق ہے۔مال جمع

کرنا یا گن گن کر رکھنا قرآن وحدیث کے مطابق قابلِ مذمت ہے۔ یہ انسان کا مغالطہ ہے کہ وہ مال کو قاضی الحاجات سمجھتا ہے۔ اسی حرصی مغالطہ میں وہ مال و دولت کو مقصود بالذات بنالیتا ہے اور انفاق سے زیادہ جمع کرنے میں لگ جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ نہ تو مال و دولت ہمیشہ رہنے والی چیز ہے اور نہ یہ مصیبت و پریشانی سے لازمی طور پر نجات دینے والی ہے۔ (۲۹) واقعہ یہ کہ معاشی کشادگی یا تنگی ہر بات پروردگار کی خاص خاص پرورشی حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی مشیت کے تابع ہے، اسی طرح بہت سے لوگوں کا یہ بھی ایک مغالطہ ہے کہ مال و دولت کی کثرت یا خوشحالی اللہ کے قرب یا رضا کی دلیل ہے۔ ہاں یہ چیزیں خوشنودیِ رب کی طلب میں مددگار بن سکتی ہیں بشرطیکہ کوئی ایمان و عمل صالح کے ساتھ انھیں احکامِ الٰہی کے مطابق خرچ کرے یا استعمال کرے۔ (۳۰)

قرآن وحدیث اور سیرِ صحابہ کی روشنی میں انفاق کی اہمیت، فضیلت و افادیت واضح کرنے کے بعد آخر میں خلاصۂ کلام کے طور پر تحریر فرماتے ہیں:

> ''اسلامی یا معادی معاشیات کی اصل روح انفاق و انفاقیت یا ایثار و قربانی ہے۔ اس میں کسب کی گنجائش جو کچھ ہے بھی تو ''زیستن برائے خوردن'' کے لیے نہیں بلکہ ''خوردن برائے زیستن کے لیے''۔ (۳۱)

آخر میں مصنف باوصف نے یہ نکتہ بھی واضح کر دیا ہے کہ انفاقی معاشیات سے کیا مراد ہے یا اسلام میں 'انفاق' سے کیا مطلوب ہے۔ خود ان کے الفاظ میں:

> ''ان مقدمات کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ اسلام کی معاشی تعلیم یا معاشیات جو کچھ بھی ہو اصلاً و اصولاً معاشیاتِ انفاق ہی ہوگی اور انفاق سے مراد ظاہر ہے کہ وہی ہوگا کہ جو ''معادی معاشیات'' کے چوکھٹے میں ٹھیک بیٹھ سکے، یعنی جس کا بنیادی مقصد معاشی ہی نہیں معادی معیار کو بلند سے بلند تر کرنا ہو۔ قرآن مجید میں دو چار جگہ کسب کی جو تعلیم ہے بھی، اس کے لیے بھی اصطلاح ''ابتغاء فضل الله'' کی ہے: وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ:۶۲/۱۰)۔ اور خدا

کا فضل وہی ہو سکتا ہے جس سے اس کی زیادہ سے زیادہ رضا حاصل ہو؛ یا بالفاظ دیگر جس سے معاد ہی کا معیار اونچا ہو"۔ (۳۲)

طوالت سے بچنے کے لیے باقی ابواب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے چھٹے باب "معاشی مسائل ومشکلات کا اسلامی حل" کے بارے میں کچھ عرض کرنا زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ باب اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ ہر دور میں یہ حل تلاش کیا جاتا رہا ہے اور جدید دور کے پروان چڑھتے ہوئے مادی ماحول نے اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھادی ہے۔

مولانا نے بڑے اچھے انداز میں مختلف پیرایہ میں یہ حقیقت بے نقاب کی کہ خالص اسلامی نقطہ نظر سے معاش کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اگر ہے تو بھی بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ان کے خیال میں ایمانی مطالبات اور ان کے تقاضوں کو مدنظر رکھا جائے تو معاد یا آخرت کے سوا معاش کیا زندگی کا کوئی بھی معاشی یا غیر معاشی مسئلہ نہ اُس معنی میں کوئی مسئلہ رہتا ہے نہ کوئی مشکل، جس معنی میں جدید وعصری معاشیات اور معاشی تعلیمات نے افراد، جماعتوں، شہریوں اور حکومتوں سب ہی کی پوری زندگیوں کو خالص معاشی یا دنیوی مسائل و مشکلات میں الجھا رکھا ہے۔ مولانا کی رائے میں صاحبِ ایمان اسے کوئی مسئلہ بنا ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کہ یہ زندگی اس کے لیے ایک سفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ تو زندگی کے جس مسافر نے سفر ہی کو منزل یا وطن نہیں بنایا ہے وہ سفر کی عارضی ووقتی خوش حالی یا راحتوں کو کوئی ایسا مسئلہ کیسے بنا سکتا ہے جس میں منہمک ہونے کی بدولت وطن کے مستقل قیام کا گھر گرتا اور بگڑتا ویران اور برباد ہوتا رہے۔ (۳۳)

مصنف محترم کے بقول "مسلمان تو درحقیقت نام ہی اس کا ہے جو دنیا یا معاش کے ہر چھوٹے بڑے معاملہ ومسئلہ کو صرف دین یا معاد کی آنکھ سے دیکھے، دنیا کو خود دنیا کی نظر سے دیکھنا ایمان کی شان کے منافی ہے"۔ (۳۴)

مختصر یہ کہ مصنفِ محترم مولانا عبدالباری ندویؒ نے اسلامی معاشیات اور جدید معاشیات سے متعلق اپنے مطالعات ونتائج فکر نہایت واضح ومدلل انداز میں اس کتاب میں

پیش کیے ہیں۔اس کا ایک امتیاز اور بہت ہی اہم پہلو یہ ہے کہ تقریباً ہر باب کی ابتداوہ ایک آیت سے کرتے ہیں اور پھر اسی کے حوالہ سے زیر بحث مسئلہ کی وضاحت فرماتے ہیں اور دوسرے مآخذ سے بھی اپنے بیان کو موکد کرتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ مصنف گرامی نے قرآن وحدیث اور دیگر مآخذ سے استفادہ کے ساتھ عقلی دلائل سے بھی اثباتِ مباحث کیا ہے۔ تیسرے یہ کہ مولانا مرحوم نے جدید ماہرینِ معاشیات کے افکار کی تنقید وتردید میں بہت عمدہ اسلوب اختیار کیا ہے اور اسلامی معاشیات کے بعض مسلم اس کالرس پر نقدان کا نام لیے بغیر کیا ہے اور بعض مقامات پر ان کے خیالات کی توجیہ بھی پیش کی ہے۔

واقعہ یہ کہ زیر مطالعہ کتاب معاشیات پر اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مشتملات، ابواب وفصول کی ترتیب اور منہجِ بحث معاشیات کی متداول کتابوں کے طرز پر نہیں ہے۔ یہ دراصل اِس نقطۂ نظر سے معاشیات کی تشکیل جدید ہے کہ ''مسلمان کا مسئلہ معاش نہیں معاد ہے'' اور اس سے جو کچھ معاشی سرگرمیاں مطلوب ہیں ان میں بھی معاد کی بہتری وبھلائی کا پہلو مقدم رکھا گیا ہے۔ اسی لیے اسلام کی معاشیات (یا اسلامی معاشیات) کو ''معادی معاشیات'' کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ در اصل اس کتاب کے ابواب کے عناوین (معاشیاتِ عبدیت، معاشیاتِ مشیت، معاشیاتِ ایمان، معاشیاتِ انفاق وغیرہا سے ہی اس کے مباحث کی نوعیت اور اس کی تالیف کی غرض وغایت متعین ہو جاتی ہے۔ مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی (مصنف ''حیات عبدالباری'') نے بجاطور پر اس کتاب کو ''ایک اہم کارنامہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ (۳۵)

اللہ کرے مصنف گرامی کے مثل ہم سب کو ہر مسئلہ میں سب سے پہلے قرآن و سنت سے رہنمائی طلب کرنے کی توفیق نصیب ہو، آمین ثم آمین۔

حواشی ومراجع

(۱) محمد نجات اللہ صدیقی، اسلام کا نظامِ محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)، مکتبہ چراغ راہ، کراچی، ۱۹۶۶ء

(۲) عبدالباری، تجدید معاشیات، تنویر پریس، امین آباد، لکھنؤ، ۱۹۵۵ء، ص ۵

(۳) تجدید معاشیات (دیباچہ)، ص ۱

(۴) تجدید معاشیات، ص ۱

(۵) تجدید معاشیات، ص ۱

(۶) تجدید معاشیات، ص ۷-۸

(۷) تجدید معاشیات، ص ۹

(۸) تجدید معاشیات، ص ۱۰

(۹) تجدید معاشیات، ص ۱۵

(۱۰) تجدید معاشیات، ص ۱۵

(۱۱) تجدید معاشیات، ص ۲۱، (بحوالہ ''وعظ صلوٰۃ الحزین''، ص ۱۴-۱۵)

(۱۲) تجدید معاشیات، ص ۲۱

(۱۳) تجدید معاشیات، ص ۲۱-۲۲

(۱۴) تجدید معاشیات، ص ۲۳

(۱۵) تجدید معاشیات، ص ۲۵-۲۶

(۱۶) تجدید معاشیات، ص ۳۰

(۱۷) تجدید معاشیات، ص ۳۱

(۱۸) تجدید معاشیات، ص ۳۲-۳۳

(۱۹) تجدید معاشیات، ص ۳۴-۳۵

(۲۰) تجدید معاشیات، ص ۳۹

(۲۱) تجدید معاشیات، ص ۴۰-۴۱

(۲۲) تجدید معاشیات، ص ۵۲-۵۳

(۲۳) تجدید معاشیات، ص ۶۲

(۲۴) تجدید معاشیات، ص ۶۳

(۲۵) تجدید معاشیات، ص ۶۳-۶۴

(۲۶) تجدید معاشیات، ص ۶۸

(۲۷) تجدید معاشیات، ص ۶۷

(۲۸) تجدید معاشیات، ص ۷۴

(۲۹) تجدید معاشیات، ص ۸۴

(۳۰) تجدید معاشیات، ص ۹۱-۹۲

(۳۵) تجدید معاشیات، ص ۱۰۳

(۳۵) تجدید معاشیات، ص ۱۰۴

(۳۵) تجدید معاشیات، ص ۴۱۵

(۳۵) تجدید معاشیات، ص ۴۱۸

(۳۵) سید محمود حسن حسنی ندوی، حیات عبدالباری، مجلس صحافت ونشریات، ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۲۰۰۹ء، ص ۳۱۴

مذہب اور سائنس

پروفیسر محمد محسن عثمانی ندوی، حیدرآباد

مولانا عبدالباری ندوی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں فلسفہ کے پروفیسر تھے ان کا شمار عقلی علوم اور مغربی فلسفہ کے بڑے اس کالروں میں کیا جاتا ہے، اگرچہ ان کے پاس ہائی اسکول کی ڈگری بھی نہ تھی، لیکن ان کی بے پناہ صلاحیت کی بنا پر عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کا تقرر ہوا تھا اور وہ بھی فلسفہ کے شعبہ کے صدر کی حیثیت سے۔ ملازمت کے جب مستقل ہونے کا وقت آیا اور کاغذات دستخط کے لئے اعلیٰ حضرت نظام حیدرآباد کے سامنے پیش کئے گئے تو کچھ حسد پیشہ اور کینہ پرور طبیعتوں نے جو ہمیشہ اور ہر جگہ ہوتے ہیں، یہ حقیقت گوش گذار کی کہ جن کو فلسفہ کے شعبہ کا صدر بنایا گیا ہے، ان کے پاس تو ہائی اسکول کی ڈگری بھی نہیں ہے۔ جب اس کے بارے میں سوال مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صدر الصدور مملکت آصفیہ سے کیا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ یہ بات صحیح ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ فلسفہ ان کے ہاتھ پر ایمان لا چکا ہے اور ثبوت کے طور پر انہوں نے مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب ''مذہب اور عقلیات'' بھیجوائی۔ حقیقت یہ کہ تعلیم یافتہ وہ شخص نہیں ہے جو ایک مرتبہ کسی درسگاہ کی ڈگری حاصل کر لے، تعلیم یافتہ وہ شخص ہے جس کے ہاتھ میں ہمیشہ کتاب ہو اور جس کا مطالعہ غیر منقطع ہو۔ چنانچہ اس دور میں سند یافتہ جاہلوں کی تعداد بڑھ گئی ہے، اب تو حال یہ ہو گیا ہے عالم اور فاضل بھی ہیں استاذ بھی ہیں، لیکن دو سطریں اردو کی نہیں لکھ سکتے جو مادری زبان ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا عبدالباری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''وہ فلسفی سے ترقی کر کے متکلم اور صوفی بن گئے، لیکن عقلیت جیسے ان کی

سرشت میں تھی، باوجود اپنے تقشف اور تصلب کے وہ محض تسبیح اور سجادہ کے صوفی ہو کر نہیں رہے؛ بلکہ بقدر ضرورت مغربی فلسفہ اور اس سے بڑھ کر ماڈرن سائنس خصوصاً شعبہ طبیعیات سے ان کا ربط اور ان کا مطالعہ قائم رہا، ''مذہب اور سائنس'' ان کی بے حد اہم کتاب ہے، کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر رضی الدین نے لکھا ہے جو پہلے عثمانیہ یونیورسٹی میں ریاضی کے استاد اور بعد میں پشاور یونیورسٹی کے اور پھر اسلام آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے اور جن کا نام نوبل پرائز کے لئے بھی پیش کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے ''قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری''۔

مولانا عبدالباری ندوی نے تعلیم ندوۃ العلماء میں حاصل کی تھی جہاں علامہ شبلی کی رہنمائی اور سرپرستی نے طلبہ کے اندر علمی کتابوں کے مطالعہ کا شوق اور عربی اور اردو انشاپردازی کا ذوق پیدا کر دیا تھا اور ندوۃ العلماء کو اس اعتبار خاص سے ہندوستان کی دوسری تمام دینی درسگاہوں پر امتیاز حاصل ہے۔ ندوۃ العلماء وہ دانش گاہ تھی جہاں پڑھ کر اور جہاں کے ماحول میں رہ کر طلبہ وسیع المطالعہ ادیب اور مصنف بن جاتے تھے، فارغین ندوہ سے ادب اور اسلامی علوم کا فلک مطلع انوار بن گیا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ بحیثیت مجموعی ندوۃ العلماء کے فرزندوں کی علمی یادگار ہے۔ علامہ شبلی ندوہ میں طلبہ پر بہت شفقت کرتے اور ان کی علمی رہنمائی کرتے تھے اور ان کی ضرورتوں کا اولاد سے بڑھ کر خیال رکھتے تھے، ان کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ علمی ہوتا تھا اور وہ اسی انداز سے طلبہ کی علمی تربیت کرتے تھے، ان کی شخصیت اس پارس پتھر کی طرح تھی کہ جو اس سے مس کرتا وہ کندن بن جاتا۔ ان کی شخصیت نسیم بہار کی طرح تھی اس کا جھونکا جس کلی کو چھوتا وہ کلی گلِ شگفتہ اور گلِ سرسبد بن جاتی، ان کی شخصیت روشن چراغ کی طرح تھی، جس کی لو سے کئی چراغ جل اٹھتے ہیں اور پھر شبستان علم میں چراغاں کا منظر سامنے آجاتا ہے، شبلی علم وادب کی دنیا میں ایک نظام شمسی کا نام ہے جو کئی سیاروں پر مشتمل ہے اور اس کے ایک سیارہ کا نام عبدالباری ندوی ہے۔ علامہ شبلی نے مولانا عبدالباری

کے انگریزی اور فلسفہ کے ذوق کو دیکھ کر ان کی اس میدان میں تعلیم کا انتظام کیا اور ان کے لئے علی گڑھ خطوط لکھے، اس طرح مولانا عبدالباری نے انگریزی کی استعداد بہم پہنچائی اور جدید فلسفہ میں ڈی کارٹ سے لے کر ہیوم اور برکلے سب کو پڑھ ڈالا، پھر انہوں نے برکلے کی کتاب (Principles of Human Knowledge) کا اردو ترجمہ ''مبادئ علم انسانی'' کے نام سے کیا اور برکلے کی سوانح اور اس کے فلسفہ پر کتاب بھی لکھی یہ دونوں کتابیں علامہ شبلی کے قائم کردہ ادارہ دارالمصنفین سے شائع ہوئیں۔

مولانا عبدالباری ندوی کی یہ کتاب ''مذہب اور سائنس'' کلام اور سائنس کے باہمی تعلق اور اثرات پر ایک نئے نقطہ نظر سے بحث کرتی ہے اور فلسفہ اور سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں قرآنی حقائق کا اثبات کرتی ہے۔ کتاب کے بارے میں مشہور سائنٹسٹ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''جب مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو انہوں نے سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا تھا ٹوٹ گیا تو پھر کائنات کی حقیقت پر غور وفکر کرنے والوں کے لئے بمصداق'' کافر نتوانی شدنا چار مسلمان شو'' خدا کی ہستی پر ایمان لانے کے لئے نئی راہیں کھل گئیں اور کم از کم ایک ہمہ گیر آفاقی ذہن (Universal Mind) کو تسلیم کرنا ناگزیر ہوگیا۔ حضرت مولانا عبدالباری نے اس حقیقت کو اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان اصحاب کے لئے جو سائنس اور ٹکنالوجی کی حالیہ غیر معمولی ترقی سے مرعوب اور متاثر ہو کر ایمان کی کمزوری کا شکار ہورہے ہیں، یقین محکم حاصل کرنے اور دنیا اور آخرت میں نجات پانے کا سامان مہیا کیا ہے''۔

ہم جس کائنات میں رہتے ہیں اس کو سمجھنا بھی آسان نہیں، یہ جہاں عجب جہاں ہے جس کی محیر العقول وسعت وعظمت ذہن کو حیران کر دیتی ہے اس کے حدود ادراک سے ماوراء ہیں، مولانا عبدالباری ندوی اپنی اس کتاب میں لکھتے ہیں:

> ایک طرف صرف ایک سورج کے مقابلہ میں ہماری مٹر برابر زمین کا

خیال کرو اور دوسری طرف اس ایک سورج جیسے کروڑوں دوسرے سورجوں کا جو اس مجموعہ میں پائے جاتے ہیں، جس کو کہکشانی نظام کہا جاتا ہے خیال کرو، پھر یہ کائنات یا عالم اس کہکشانی نظام پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس جیسے لاکھوں لاکھ سحابے خلا میں تیر رہے ہیں اور ہم سے قریب ترین سحابہ بھی چھ کروڑ اڑسٹھ ہزار نواسی نوری سال(Light Years) کی دوری پر واقع ہے اندازہ لگایئے دور ترین سحابہ کہاں ہوگا۔

روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہے اس کے باوجود جب ہم سورج کو دیکھتے ہیں تو وہ آٹھ منٹ پہلے کا سورج ہوتا ہے، اسی طرح جس قریب ترین ستارہ کو ہم دیکھتے ہیں وہ چار سال پہلے کا ہوتا ہے۔ پانی کے ایک قطرہ میں لاکھوں بلکہ اربوں کھربوں سالمات پائے جاتے ہیں، پھر اس سالمہ کے اندر اس سے بھی بہت چھوٹے چھوٹے الکٹران یا برقی ذرات پائے جاتے ہیں جن کے مابین ایسے ہی فاصلے پائے جاتے ہیں، جیسے آفتاب اور اس کے سیاروں کے درمیان ہوتے ہیں۔ اس کائنات کی حقیقتیں ذہن کو چکرا دینے والی اور دماغ کو بوکھلا دینے والی ہیں، اس کائنات کے طلسم کے آگے طلسم ہوش ربا بھی ہیچ ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر کوئی اور طلسم ہوش ربا نہیں، یہ کائنات اسرار کا مجموعہ ہے، انسان اسرار پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے، انسان ذرہ ذرہ کا جگر چاک کرنے اور نامعلوم کو معلوم بنانے کی کوشش کرتا ہے، مگر یہ چشم حیراں ہے کہ اس کی حیرانی بڑھتی جاتی ہے۔ اس دنیا میں ترقی یافتہ ملکوں نے نظام شمسی کے صرف ایک چاند تک اپنی کمند پھینکی ہے اور سیارہ مریخ کے بارے میں کچھ قیاسی باتیں حاصل ہوئی ہیں، لیکن اس نظام شمسی کے ماوراء ہزاروں لاکھوں نظام شمسی کہکشاں اور سحابے موجود ہیں، اس کائنات پر غیب کے جو پردے پڑے ہوئے ہیں انسان ان کے جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے، لیکن کائنات کا غیب ہی ابھی تک لامعلوم ہے اور جو اس کائنات سے ماوراء کائنات

ہے اور جو دوسری دنیا ہے اس کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں، سوائے اس کے کہ ہم پیغمبر کی بات پر ایمان لائیں۔ وہ جو انسانوں کی اور تمام مخلوقات کی جسمانی پرورش کرتا ہے، اس سے بعید تر یہ بات ہے کہ انسانوں کو پیدا کرنے والے سے اور پیدا کرنے کے مقصد سے اور کائنات کے انجام سے بے خبر رکھے اور عقل سے بعید تر یہ بات بھی ہے کہ انسان اپنے مقصد تخلیق کو اور پیدا کرنے والے کو جاننے کی کوشش نہ کرے۔

یہ کائنات ایک کہنہ کتاب ہے، جس کے اول اور آخر کے اوراق ندارد ہیں، اس کتاب کے مصنف (اللہ تعالیٰ) اور زمانہ تصنیف اور مقصد تصنیف اور پیغام تصنیف کو جاننے کا ایک طریقہ ہی ہے کہ انسان کھوج میں لگا رہے اور ظن وتخمین سے کام لے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مصنف کتاب یعنی اللہ کی طرف سے ہر زمانہ میں جو رسول بھیجے گئے ہیں اور ان رسولوں پر جو کتاب بھیجی گئی ہے ان پر ایمان لائے۔

غزالیٔ وقت -مولانا عبدالباری ندویؒ

مولانا سید سلمان حسینی ندوی (۱)

یہ مقالہ درحقیقت مولانا عبدالباری ندویؒ کی معرکہ آراء کتاب ''مذہب وسائنس'' کی تلخیص ہے، میں نے زمانۂ طالب علمی میں اس کو پڑھا تھا، لیکن اس وقت کیا سمجھتا، اب بھی یہ دعوی نہیں کرسکتا ہوں کہ میں نے پوری طرح اس پر عبور حاصل کرلیا ہے؛ لیکن اب کتاب کو پڑھ کر مجھ پر یہ تاثر ضرور ہوا کہ یہ فلسفۂ سائنس کی خودکشی کا اعلامیہ ہے۔

یہ تلخیص اب ان قارئین کی خدمت میں پیش ہے، جن کو ضخیم کتاب پڑھنے کا موقع نہیں، یا حوصلہ نہیں۔

حضرت تھانویؒ نے مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب ''مذہب وعقلیات'' پڑھ کر فرمایا تھا ''یہ مذہب کا آہنی قلعہ ہے'' مولانا کے نزدیک یہ تبصرہ ہر تبصرہ سے بڑھ کر تھا۔

بہرحال ''مذہب وسائنس'' ''مذہب وعقلیات'' کے نقش اول کی تکمیل کی شکل میں مولانا علی میاں کے اصرار پر سامنے آئی، اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (لکھنؤ) کو اس کی اشاعت کا شرف حاصل ہوا۔

مذہب وسائنس پر مقدمہ مسلّم ومستند فاضلِ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے مولانا کے رفیقِ قدیم، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا ہے، جو بعد میں اسلام آباد یونیورسٹی پاکستان کے وائس چانسلر رہے، مولانا نے سائنس کا جب مطالعہ شروع کیا، تو سائنس کی درجنوں کتابوں کا چوتھائی صدی تک مسلسل مطالعہ کیا، فاضل مقدمہ نگار نے بیسویں صدی میں سائنس میں جو بھونچال آیا ہے، مقدمہ میں اس کا جائزہ لیا ہے۔

---

(۱) عمید کلیہ الدعوۃ والاعلام، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، صدر جمعیت شباب اسلام، لکھنؤ۔

۱-مولانا عبدالباری- رحمۃ اللہ علیہ- نے''مذہب وسائنس'' کتاب کے آغاز میں انسان کی دریافت کی سب سے پہلے کوشش کی ہے، انہوں نے افلاطون کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے ایسی بھونڈی اور بے پر کی بات اڑادی کہ''انسان دوٹانگوں والا بے پر کا جانور ہے'' اس پر بلیز پسکال (Blaise Pascal) نے یوں خاکہ اڑایا:۔

''انسان کیا ہی عجیب الخلقت واقع ہوا ہے! کیا ہی انوکھا! کیا ہی ہیولیٰ! کیا ہی مجموعۂ اضداد! نادرۂ روزگار! ساری چیزوں پر فیصلہ صادر کرنیوالا (جج) زمین کا ایک حقیر کیڑا! سچائی کا تحویلدار! بے یقینی اور غلطی کی گندی نالی! کائنات کی آبرو بھی اور رسوائی بھی'' (۱)

انسان کے بارے میں فرانس کے ایک نامی گرامی مصنف ڈاکٹر'' کاریل'' نے ایک کتاب''نامعلوم انسان'' (Man The Unknown) کے عنوان سے لکھی ہے۔

''گو ہمارے پاس دنیا بھر کے علماء سائنس وفلسفہ، اوراشراقیہ یاسرّیہ (Mystics) کے فراہم کردہ معلومات ومشاہدات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، تاہم خود اپنی (انسانی) ذات وحقیقت کے صرف چند پہلو ہی کچھ گرفت میں آسکے ہیں، پوری طرح انسان کو ہم نے نہیں جانا ہے، بس کچھ پراگندہ یا الگ الگ اجزاء کا اس کو ایک معجون مرکب سمجھ رکھا ہے، اور یہ اجزاء بھی خودساختہ ہیں''۔ (۲)

ایک اور بڑے سائنس داں (A.W. Hasle) نے''سائنس کے ناحل مسائل'' (Unsolved Problems) پر کتاب لکھی، اس میں''انسان'' ایک معمہ بنا ہوا ہے:۔

اس سب کے باوجود یوروپ کے نادان کبھی اس کو بندر کا خلف بتاتے ہیں کبھی ہائر اینمیل (Higher Animal) (اعلیٰ جانور)۔

۲-مولانا نے انسان کی حقیقت کا راز یوں کھولا کہ انسانیت نام ہے،''مجسم نامحدودیت طلبی'' کا، تمام حیوانات کے لگے بندھے نظام کو دیکھئے، اور انسان کے تمدن کی گونا گونی، تنوعات اور غیبوں کی دریافت کو دیکھئے، یہ سب نتیجہ ہے کہ انسان کے''شعور غیب'' کا جس سے تمام جاندار خالی ہیں، ان کے نزدیک انسانیت درحقیقت''غیبوں کا احساس'' یا''شعور

غیب'' ہے، جو اسے کہیں قیام وقرار، یا چین وٹھہراؤ اختیار کرنے نہیں دیتا۔

ان کا کہنا ہے کہ انسان کو حیوان ناطق یا عاقل (Rational) یا حیوانِ متمدن (Social) کہنے کے بجائے ''حیوان مومن'' کہنا درست ہوگا، یہ اس کا ''ایمان بالغیب'' ہے، جو اس کی ''نامحدودیت طلبی'' کا منشاو مرجع ہے۔

۳-مولانا کا کہنا ہے کہ غیب کی دو قسمیں ہیں، ایک اعتباری واضافی غیب اور ایک اطلاقی وحقیقی غیب۔

انسان کے لئے جو کل غیب تھا، وہ آج شہود ہے، جو چند لمحے پہلے غیب تھا، وہ چند لمحات بعد شہود ہے، نئے نئے انکشافات، اور تحقیقات اضافی غیب کے پردے ہٹا رہے ہیں۔ لیکن آخری غیب اور غیب الغیوب تک پہونچے بغیر انسان اطمینان کا سانس نہیں لے سکتا، جے-ایس میزکانزی لکھتا ہے:

''انسان کا دکھ اس کی بڑائی ہے، اس میں نامحدود کی ایسی طلب اور تڑپ ہے، جس کو وہ اپنی چالاکی اور ہوشیاری کے باوجود محدود کے اندر دفن نہیں کرسکتا'' (Manual Of Elhies By J.S.Maceanzi)۔

جس زمین پر ہم آباد ہیں، وہ ہمارے نظام شمسی کا صرف ایک سیارہ ہے، جو سورج کے مقابلہ میں مٹر کے ایک دانہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتا، سورج تو سورج سیارہ مشتری اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہماری جیسی ایک ہزار سے زیادہ زمینیں سما سکتی ہیں، پھر آسمان پر جو چھوٹے چھوٹے تارے دکھائی دیتے ہیں، ان میں اکثر سورج کے برابر اور بہت سے خود سورج سے اتنے بڑے ہیں کہ ان میں دس ہزار سورج سما سکتے ہیں، تارے وہ کہلاتے ہیں جو خود بخود روشن ہیں، یعنی جو اس وقت جلتی ہوئی گیس کی حالت میں پائے جاتے ہیں، باقی جو ٹھنڈے ہو چکے ہیں، جیسے ہماری زمین اور مریخ وغیرہ سیارے کہے جاتے ہیں، اس وقت کے معلوم ومشہور سیاروں کی تعداد نو ہے، ان میں سے بعض سیاروں کے ساتھ ان کے توابع یعنی چاند بھی پائے جاتے ہیں، زمین کے ساتھ ایک چاند ہے، مریخ کے ساتھ دو، اور زحل کے ساتھ نو، سورج بھی

درحقیقت ایک ہے جومختلف عناصر، لوہے، المونیم، جست، نکل وغیرہ کے جلتے ہوئے بخارات یا گیسوں کا بہت بڑا کرہ ہے، اس سے آنیوالی روشنی زمین تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے، روشنی کی رفتار فی ثانیہ (سکنڈ) ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے:۔

''ہم عالم سے مراد بعض اوقات صرف اپنا ہی کواکبی نظام (جس کا ایک رکن ہمارا آفتاب ہے) اور تاروں کا وہ عظیم مجموعہ لیتے ہیں جس کو کہکشاں کہتے ہیں، لیکن دراصل یہ صرف ایک عالم یا ہمارا عالم ہے، اس کے علاوہ بہ کثرت ایسے عوالم پائے جاتے ہیں جو ہمارے اس عالم سے بالکل باہر نہایت دور دراز فاصلوں پر واقع ہیں، ان ہزاروں ہزار عالموں میں ہر ایک اتنا ہی عظیم الشان ہے، جتنا کہ یہ ہمارا عالم، جدید فلکیات نے ہماری نظر کو بہت وسیع کر دیا ہے، یہی نہیں کہ اس عالم یا کائنات سے متعلق ہمارا علم وتصور مسلسل وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، بلکہ خود پوری کائنات بجائے خود بھی روز بروز وسیع تر ہوتی یا پھیلتی جا رہی ہے، جن بعید ترین اجرام سماوی کو ہم موجودہ بڑی سے بڑی دوربین سے دیکھ سکتے ہیں وہ بھی اتنے بعید فاصلہ پر واقع ہیں کہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ کی رفتار سے حرکت کرنے والی روشنی کو ان اجرام سے ہم تک آنے میں ایک سو چالیس ملین (چودہ کروڑ) سال لگ جاتے ہیں، سب سے قریب چاند ہے وہ بھی دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے، سورج قریباً نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے، تاروں میں قریب ترین تارہ (Alpha Paxima) نوری یا روشنی کے سالوں کے حساب سے چار سال کی دوری پر واقع ہے، ہمارا ذہنی تخیل جواب دے جاتا ہے، جب کہا جاتا ہے کہ ایسے سدیم یا سحابے (Nebula) پائے جاتے ہیں، جو روشنی کے (۳) سالوں کے حساب سے سوملین (دس کروڑ) سال کی مسافت پر واقع ہیں، کوئی انسانی ذہن ان فاصلوں کے تصور پر قادر نہیں۔ (۴)

ایک طرف صرف ایک سورج کے مقابلہ میں ہماری مٹر برابر زمین کی دنیا کا خیال کرو اور دوسری طرف اس ایک سورج جیسے کروڑوں دوسرے سورجوں کا جو اس مجموعہ میں پائے جاتے ہیں، جس کو کہکشانی نظام کہا جاتا ہے، پھر یہ کائنات یا عالم اس کہکشانی نظام پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس جیسے لاکھوں لاکھ سحابے (Nebula) خلا میں تیر رہے ہیں، اور ہم

سے قریب ترین سحابہ بھی چھ کروڑ ارسٹھ ہزار نوری سال (Light Years) کی دوری پر واقع ہے، اندازہ لگایئے کہ دور ترین سحابہ کہاں ہوگا''۔(۵)

''اجرام سماوی میں سب سے قریب ہمارے علم ومشاہدہ کے لیے نظام شمسی ہے، اس کے بعد چند ہزار ملین روشنی کے سالوں تک علمائے فلکیات کا سائنسی مشاہدہ ومطالعہ اور کام دیتا ہے، پھر آگے روشنی اور ریڈیائی لہریں اتنی کمزور ہو جاتی ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ اب اور آگے کیا ہے''۔

ساتھ ہی یاد رکھنا چاہئے کہ:۔

''مثلاً آفتاب کو جب ہم کسی وقت دیکھتے ہیں تو وہ آٹھ منٹ پہلے کا آفتاب ہوتا ہے، اس طرح قریب ترین جس ستارہ کو ہم دیکھتے ہیں، وہ چار سال پہلے کا ہوتا ہے۔

باقی خود اپنی کہکشاں سے آگے (Extragalactic) جن کا نسبتاً قریب کے پڑوسی ستاروں کی روشنی اور ریڈیو کی لہروں کے واسطے سے مطالعہ کرتے ہیں، یہ لہریں ملینوں سال پہلے سے سفر کرتی آرہی ہوتی ہیں، لہٰذا ان کی نسبت ہماری اطلاع وعلم بھی اتنا ہی پرانا فرسودہ (Out Of Date) ہو چکتا ہے، اس طرح آج کے مشاہدات پر مبنی ہماری معلومات ہزاروں ملین سال کی فرسودہ (Out Of Date) ہوتی ہیں''۔

آج ہماری دوربینیں اتنی طاقتور ہیں کہ:۔

''غالباً وہ قابل مشاہدہ (Observable) کائنات کی آخری حدوں تک رسائی پا چکی ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ سائنسی علم کے اعتبار سے ہم کائنات کی قابل رسائی حدوں تک پہونچ چکے ہوں، لہٰذا کائنات کی تعمیر وتشکیل سے متعلق (Cosmological) جو مضمرات ان میں پنہاں ہیں، وہ پہلے کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں''۔

ہم سے قریب ترین ستارہ بھی اتنی دور ہے کہ:۔

''اس کی روشنی ہم تک آنے میں چار سال لگ جاتے ہیں، حالانکہ روشنی ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سفر کرتی ہے۔

ہم جس کہکشانی نظام میں واقع ہیں، بیسویں صدی کی دوربینوں کے ذریعہ اس کے ستاروں کی تعداد تقریباً دس ہزار ملین معلوم ہوئی ہے، پھر بھی ہماری یہ کہکشاں بجائے خود صرف ایک مقامی کہکشانی نظام ہے، جس کے علاوہ اور بے شمار کہکشانی نظامات پائے جاتے ہیں''۔

ان سے بھی ماوراسحابے (Nebula) پائے جاتے ہیں، جن کے معلوم کرنے کے لیے:

''بیسویں صدی کی امریکہ کے ''کوہ وِلسن'' (Mount Wilson) کی دوربین درکار تھی، جس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ سحابے دراصل ستارے ہیں، جو کہکشاں سے بے انتہا دور فاصلوں پر پائے جاتے ہیں، ''اینڈرومیڈا'' (Andromeda) سحابہ سے جو روشنی ہماری دوربین تک پہنچتی ہے، وہ بیس لاکھ سال سے گزر رہی ہوتی ہے ہم خلا (Space) میں جہاں بھی دیکھیں یہ سحابے موجود ملتے ہیں۔

اور صرف کائنات کے ان حصوں کا ہم اپنی جدید دوربینوں کے ذریعہ مطالعہ کر سکے ہیں، ورنہ یقینی طور پر ہزاروں ملین بلکہ غالباً بلینوں (Billions) بے شمار سحابے (نیبولے) پائے جاتے ہیں، جو سب کے سب بجائے خود ہزاروں ملین ستاروں سے بنے ہوئے کواکبی (Stellor) نظامات (Systems) ہیں''۔

اور سنئے کہ:۔

''جس قدر خلا یا مکان (Space) میں ہم پیچھے (Ruede) کی طرف بڑھتے جاتے ہیں، کہکشانوں کا پھیلاؤ (Expansion) بھی برابر بڑھتا ہی جاتا ہے، ہمارے روزانہ مطالعہ کا ایک مجموعہ یا تارہ منڈل (Constellation) جس کا نام ''سگنوس'' (Cygnus) ہے، یہ ایک سکنڈ میں دس ہزار میل کی رفتار سے برابر پیچھے ہٹتا جا رہا ہے''۔

اجرام سماوی کی سائنسی یا اس فلکیاتی طلسم ہوش ربا میں اصل بات یاد رکھنے کی یہ ہے، کہ اس اتھاہ کائنات کا اصل اطلاقی ''غیب الغیب'' بدستور دور ہے اور غیب ہی غیب رہتا ہے:

''اگر [illegible] کی اتنی وسعتوں اور ماضی کی طرف اتنے فاصلوں تک

۔ ہم کچھ نہ کچھ کھوج لگا چکے ہیں، پھر بھی ہمارے پاس اس مسئلہ کا کوئی آخری جواب نہیں کہ جب کائنات پیدا ہوئی اس وقت کیا صورت تھی؟

اصل یہ ہے کہ اس طرح کے سوالات میں ہم سائنسی مشاہدہ کی دنیا سے نکل کر فلسفیانہ نظریات وقیاسات کی دنیا میں جا پڑتے ہیں''۔(٦)

۴-دو ہزار سال سے کائنات کے مادی تصور کا فلسفہ جو یونان میں نقطۂ عروج پر تھا، وہ یہ کہ کائنات کی تمام اشیاء ناقابل تقسیم ذرات (ایٹم) سے بنی ہیں، جس کی مزید تجزی اور تقسیم نہیں ہوسکتی۔

۵-لیکن انیسویں صدی کے اوائل میں مانچسٹر کے مشہور ماہر کیمیا ''جان ڈالٹن'' نے اس یونانی تصور کو باقاعدہ ایک سائنسی مفروضہ (Hypohesis) کی حیثیت عطا کی، کہ کسی جسم کو تقسیم کے عمل سے گذارا جائیگا تو بات آخری ایٹم تک پہنچے گی، مثلاً پانی کے سالمات (مکسرات) (Molecule) کو الگ کیا جائیگا، تو اس کا ایک عنصر ''آکسیجن'' اور دوسرا ''ہائیڈروجن'' الگ ہو جائیں گے پھر مزید تقسیم نہیں ہوسکتی۔

٦-کیمیائی عناصر کے چھوٹے ذرات کا یہ حال ہے کہ یہ بال کے دس لاکھویں حصہ سے بھی زیادہ باریک ہوتے ہیں، مختلف حسابوں سے اندازہ لگایا گیا ہے، کہ ایک سالمہ (Moluale) مثلاً ایک نیل کے دانہ میں کروڑوں ''سالمے'' ہوتے ہیں، اور ایک سالمہ کا قطر ایک انچ کے پانچ کروڑویں حصہ سے بھی کم ہوتا ہے، اگر ایک سالمہ کو یکے بعد دیگرے رکھا جائے تو ایک انچ کے لئے چالیس کروڑ سالمات درکار ہیں، ''ہائیڈروجن'' کا ایک سالمہ ایک سکینڈ میں ایک میل سے زیادہ حرکت کرتا ہے، یہ رائفل کی گولی سے زیادہ تیز رفتار ہوتا ہے، اور ایک انچ کے ہر بیس ہزارویں حصہ کی مسافت پر یہ دوسرے سے ٹکراتا ہے، اور ان ٹکروں کی بنا پر ہر سکنڈ پر پانچ ارب مرتبہ اپنا راستہ بدل لیتا ہے، (دیکھیے ModernBilief حصہ چہارم ص ۲۲۱-۲۲۴ تک)۔

۷-ماہرین کیمیاء کا پہلے یہ خیال تھا کہ تقریباً (۹۰) قسم کے ایٹم کی مختلف قسمیں

پائی جاتی ہیں، اب ان کی تعداد (۱۰۴) بیان کی جاتی ہے۔

۸- ذرات (ایٹم) کے نا قابل تقسیم ہونے کا خیال، عکس ریز شعاعوں (X rays) کے انکشاف سے ایک انقلاب سے دوچار ہوا، یہ شعاعیں نہ مادہ کی صورت ہیں، نہ مادی ذرات کی، بلکہ شعاع فشانی اور تابکاری (Radiation) کی ایک قسم ہیں۔

۹- سب سے پہلے یہ انکشاف ہوا کہ ''ریڈیم'' (Radium) اور یورینیم (Uranium) جیسی دھاتوں سے تین قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں، الفا- بیٹا- گاما- ان میں سب سے زیادہ دلچسپ ''بیٹا'' شعاعیں ہیں، ان ہی کا نام آگے چل کر ''الکٹران'' (۷) برقی ذرات پڑ گیا۔

۱۰- اب یہ ثابت ہو گیا ہے، کہ ہر مادہ ان ہی برق پاروں سے بنا ہے، یہ منفی برق کی اکائیاں ہیں، جن کا مرکز مثبت برق کی اکائیاں ہوتی ہیں جنکو پروٹان (۸) (Proton) کہا جاتا ہے۔

الکٹرون کا جداگانہ وجود صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے، جب کہ وہ کم از کم چھ سو میل فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہو، ورنہ پھر جو پہلا ایٹم اس کو مل جاتا ہے، اس میں مدغم ہو جاتا ہے، یہ برقی ذرات (الکٹران) دس ہزار سے لیکر ایک لاکھ میل تک فی سکنڈ تیز رفتاری سے حرکت کر سکتے ہیں۔

یہ الکٹران چھوٹے سے چھوٹے معلوم ایٹم سے بھی ہزاروں گنا چھوٹے ہوتے ہیں، تازہ ترین پیمائشوں کی رو سے ہر ذرہ کی کمیت (Mass) ہائڈروجن کے ایٹم کی ۱/۱۸۴۵ ہوتی ہے، ان برق پاروں کے انکشاف سے مادہ کے آدھے اسرار کی کلید ہاتھ آ گئی ہے، برقی رو (Current) جس کو کچھ ہی دن پہلے تک فطرت کا ایک نہایت ہی پر اسرار مظہر خیال کیا جاتا تھا، اس کی توجیہ ان برق پاروں کی تیز رفتاری سے ہو گئی''۔

غرض زمین و آسمان کے لاتعداد اجسام و اجرام جن کو ہم آنکھوں دیکھا جیسا ٹھوس جانتے تھے، نہ صرف یہ کہ وہ ایک بال کے لاکھویں حصہ سے بھی زیادہ باریک ان دیکھے ایٹم یا ذرات سے مرکب ہیں، بلکہ خود یہ ایٹم جو ابھی گئی صدی کے آخر آخر تک بجائے خود بالکل

ٹھوس جامد، ناقابل کسر وانکسار اور ہر طرح قطعاً ناقابل نفوذ تصور کئے جاتے تھے، آپ نے دیکھا کہ اب یہ ایک بال کے دس لاکھویں حصہ سے بھی زیادہ باریک اپنے سے بھی ہزاروں گنا چھوٹے ذرات سے مرکب ثابت ہوئے اور جس طرح:۔

''ستارے، انسان، موٹر، مماکھی، چیونٹی، مچھلی، سمندر، چڑیا اور ہوا ہر چیز اور سارا مادہ ایٹموں میں تحلیل ہو جاتا ہے، اسی طرح سالمات منفی مثبت برق پاروں (Charges) یعنی مادۂ برق یا بجلی کے سوا کچھ نہیں''۔

کہا جاتا ہے کہ سالمہ کی اس تحلیل یا ایک مزید غیب در غیب کی دریافت نے کائنات کی نسبت نفس خیالات ہی میں عظیم انقلاب نہیں برپا کر دیا، بلکہ طرز فکر ہی کو سرے سے اتنا بدل ڈالا ہے کہ کائنات کی تعمیر میں مادہ سے بے انتہا زیادہ حصہ خلا، یا کہنا چاہئے کہ عدم مادہ کا ہے، مادی سالمات اسی خلا یا غیر مادی خلا یا عدم مادہ میں تیرتے پھرتے ہیں، پھر:۔

''ہر سالمہ میں بھی بہت زیادہ حصہ خلا ہی خلا کا ہوتا ہے، نسبۃً اتنا زیادہ جتنا مختلف ستاروں کے مابین (لاکھوں میل کا) مثلاً انسانی جسم کی ترکیب وتشکیل کو بالکل ملا دیا جا سکے کہ درمیان میں کوئی جگہ یا خلا نہ رہے، تو اس کی حیثیت بس ایک ایسے چھوٹے سے دھبہ کی رہ جائے گی جس کا دیکھنا بھی دشوار ہوگا، ہر سالمہ چھوٹے پیمانہ پر گویا ایک نظام شمسی ہوتا ہے، جس میں آفتاب (مرکز یا پروٹان) کے گرد سیارات یا الکٹران حرکت کرتے رہتے ہیں، اور ان کے مابین نسبۃً اتنا ہی خلا یا خالی جگہ پائی جاتی ہے، جتنی مختلف سیاروں اور آفتاب کے درمیان''۔

۱۱-الکٹران اور پروٹان کی تحقیق کے بیس سال بعد ایک اور ''سالمہ'' کا پتہ چلا، جس کو نیوٹران (Neutron) کا نام دیا گیا، پھر دو (۲) سال بعد ایک اور ذرہ (Atom) کا پتہ چلا جس کو ''پازیٹران''، کا نام دیا گیا۔

۱۲-ایک طرف کائنات کی وسعت اور اس کے ایک ایک کرہ کا حجم اور اس کا فاصلہ دیکھئے دوسری طرف ان کی مادی حیثیت پر غور کیجئے تو یونانی فلسفہ اور انیسویں صدی کی ابتداء کا مادہ تو اب کائنات میں کہیں نہیں رہ گیا، اب تو جو کچھ ہے وہ برقی لہریں ہیں۔

''خالی آنکھ سے جو ستارے دیکھے جا سکتے ہیں، ان کی تعداد دس ہزار سات سو (۱۰۷۰۰) ہے، باقی بڑی بڑی دوربینوں سے سات کروڑ (ستر ملین) تک دیکھے جا سکتے ہیں، اور فوٹو گراف میں یہ تعداد ہزاروں ملین تک جا پہنچتی ہے، لیکن مدہوش کر دینے والے یہ اعداد اصل میں بیرونی خلا میں شروع ہوتے ہیں، جہاں کروڑوں (ملینوں ملین) سحابے اور اربوں ارب ستارے پائے جاتے ہیں، انسانی ذہن کو چکرا دینے والے یہ اعداد و شمار کسی پاگل دماغ کی پیداوار معلوم ہونے لگتے ہیں''۔

پاگل دماغ کی اس پیداوار کے بارے میں مزید نہیں سنئے:

''یہ ناقابل یقین اعداد و شمار بھی بجائے خود ہیچ در ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں جب ہم ان کے مقابلہ میں کائنات کی اس وسعت و پہنائی کا خیال و اندازہ کرتے ہیں کہ ان اربوں کھربوں ستاروں، کہکشانوں، سحابوں وغیرہ کی بساط، کائنات کی وسعت میں ایسی ہے جیسے اگر زمین کو ایک بالکل خالی کرہ فرض کر لیا جائے تو اس میں ایک ذرہ کی ہوگی''۔(۹)

۱۳- چھوٹے چھوٹے مادہ (سالمہ) کی تحقیقات آگے چلتے چلتے یہاں تک پہونچیں، کہ حال ہی (یعنی مولانا کے زمانہ میں) میں نیوز (News)(۹/جولائی ۱۹۶۴ء) کی ایک اخباری اطلاع میں کہا گیا۔

''سائنسدانوں نے ایک نیا مادی ذرہ دریافت کیا ہے جو مادہ کا بنیادی جزء ہے، لیکن جس کا وجود ایک سکنڈ کے ایک کھربویں کے ایک سوویں حصہ کی مدت تک ہی رہتا ہے''۔ اس ذرہ کو ''سی ناٹ'' کا نام دیا گیا ہے۔

۱۴- آرتھر ایڈنگٹن کا کہنا ہے:

''ہم کو مادہ کے ٹھوس جوہر ہونے کا عامیانہ خیال اپنے ذہن سے نکال دینا چاہئے'' مادی دنیا انتہائی تحلیل کے بعد غیر مادی ثابت ہو چکی ہے، موجودہ سائنس میں مادہ کی جوہریت کا خاتمہ ہو چکا ہے، یہ کوئی نظریہ نہیں، سائنس کا مسلمہ بن چکا ہے، معمولی عقل و فہم نے ''مادہ'' اور ''زمان و مکان'' سے کائنات کا جو نقشہ بنایا تھا، وہ سارا سائنس نے منسوخ اور قلم زد کر دیا ہے(۱۰)

"Modern Belief" کا مصنف کہتا ہے:

"سائنس نے اس کو پوری طرح ثابت کر دیا ہے کہ اس عالم شہادت یا ظاہر کے باطن یا تہہ میں پائی جانے والی (غیبی) حقیقت اس سے بالکل ہی مختلف ہے، جیسی ہم اب تک سمجھتے چلے آرہے تھے، جن چیزوں کو ہم حقیقی خیال کرتے تھے، وہ محض انسانی ذہن کی ساختہ پر داختہ نکلیں، جس حقیقت کو ہم زماں (Time) اور مکان (Space) سے تعبیر کرتے ہیں، وہ ایک ایسی نا قابل تصور کوئی شئی ہے جس کو صرف عالم ریاضیات ہی بیان کر سکتا ہے"۔ (۱۱)

"زمان و مکان گویا ایک ڈھانچہ یا قالب ہے، جس کے اندر یہ ازلی وابدی کائنات واقع ہے، لیکن اضافیت کے نظریہ کی رو سے کسی ایسی چیز کا جس کو مطلق اور مستقل بالذات زمان و مکان کہا جاسکے، سرے سے کوئی وجود نہیں، رہا ہمارے روزمرہ کے زمان و مکان کا تصور، وہ ہمارے انفرادی تجربہ سے ماخوذ، یعنی ایک طرح کا بس مقامی زمان و مکان ہے۔

ہم سمجھتے تھے کہ دو چیزوں کے درمیان کا فاصلہ یا دو واقعات کے درمیان کا زمانہ کوئی محدود و متعین شئی ہے یہ خیال بھی غلط نکلا۔

اور نظریۂ اضافیت کی بنا پر زمان و مکان کا ڈھانچہ غائب ہو کر سہ ابعادی دنیا کی جگہ چار ابعادی دنیا نے لے لیا، یہ چوتھا بُعد زمان ہے، زمان و مکان مستقل و مطلق حقیقتوں کی حیثیت سے کوئی وجود نہیں رکھتے، بلکہ دونوں ایک ہی متحد اور غیر منقسم حقیقت ہیں، جس کو "زمان-مکان" کہنا چاہیے، اور اب تو (آئنسٹائن) کے نظریہ کے مطابق زمان و مکان کے مستقل بالذات وجود کو ثابت کرنے کیلئے جتنے اختبارات کئے گئے سب ناکام ثابت ہوئے، نہ سائنس کو اپنی تحقیقات کے لئے مستقل و مطلق زمان و مکان کا وجود فرض کرنے کی کوئی ضرورت رہی ہے۔

یہ مطلب نہیں کہ زمان و مکان کے ہمارے روزمرہ کے تصورات کا خاتمہ کر دیا گیا، وہ بدستور انفرادی تجربہ کے ڈھانچہ یا مقامی زمان و مکان کی حیثیت سے اپنی جگہ قائم ہیں، کائنات فطرت (نیچر) کے لئے وہ بجائے خود کتنے ہی بے معنی ہوں، لیکن ہمارے لئے اب بھی وہ بامعنی ہیں (۱۲)، تاہم اگر مادہ وہ مادہ نہیں رہا جو ہم معمولی عقل و فہم سے سمجھا کرتے تھے، تو زمان

ومکان سے بھی بہت کم وہ زمان ومکان باقی رہ گئے جو ہم اس سے پہلے سمجھا کرتے تھے"۔

آج بیسویں صدی کی جدید سائنس میں عام آدمی کے لئے سب سے دشوار بلکہ ناممکن اضافیت ہی کے نظریہ کو سمجھنا ہے، اعلیٰ ریاضیات میں پوری مہارت رکھنے والا ذہن ہی اس کو سمجھ سکتا ہے، کیونکہ اس نظریہ کی رو سے ہمارے عام تصور والے یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ:

"نہ مطلق زمان کا کوئی وجود رہ گیا ہے، نہ مکان کا، مستقل بالذات یا بجائے خود موجود، نہ زمان پایا جاتا ہے، نہ مکان، پھر یہ غیر مستقل زمان بھی نہ مکان کے بغیر پایا جاسکتا ہے، نہ مکان زمان کے بغیر، دونوں قطعاً ناقابل انفصال ہیں، دونوں بالکلیہ ہم وجود اور ایک دوسرے پر موقوف ہیں، ان ہی سے وہ دنیا بنتی ہے، جس کو ابعادی زمان ومکان مسلسلہ (Space Time Continum) کہتے ہیں۔

یہ خالصۃً ایک ریاضیاتی تصور یا نظریہ ہے، اور ریاضیاتی نظریوں کے لئے کوئی طبعی مظروف یا مشمول (Content) نہیں پیش کیا جاسکتا، اضافیت ریاضیاتی علامتوں (Symbols) میں جو کچھ بیان کرتی ہے، ہمارا متخیلہ اس کا کوئی تصور قائم نہیں کرسکتا"۔

۱۵- مادہ کی شکست وریخت اور علت ومعلول کے اٹل قوانین، جو یونانی فلسفہ کی ہی نہیں پورے مغربی فلسفہ کی اساس وبنیاد تھے، سب ڈھیر ہوچکے ہیں۔

"ابھی تک مادی دنیا میں علت ومعلول کا قانون نہایت سختی سے کارفرما سمجھا جاتا تھا اور سارے طبعی واقعات وحوادث بالکلیہ علیت کے جبری قوانین پر مبنی یقین کئے جاتے تھے، علل ومعلولات کے سلسلہ میں کہیں کوئی خلل ورخنہ نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن ۱۹۲۷ء میں اس خیال کو سخت دھکا لگا اور ماہرین طبعیات نے دیکھا کہ قطعی وکلی علیت کو مادی دنیا سے خیرباد کہنا پڑا"۔

اصل میں علت ومعلول کا قانون ساری مادّی کائنات سے غائب اس لئے ہوگیا کہ اس کائنات کے تعمیر میں مادہ کے جوذرّات:۔

"بنیادی اینٹیں (الکٹران، پروٹان وغیرہ) ہیں، خود وہی سرے سے کسی علت ومعلول کے قانون کی تابع نہیں معلوم ہوتیں، حتیٰ کہ ان کے سارے حالات کا علم ہو بھی

جائے، تو بھی ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ فلاں ذرہ ایک سکنڈ ایک منٹ یا ایک سال بعد کیا کر رہا ہوگا، (What Might Be Doing) اور آئندہ کیا، اس وقت بھی تعین کے ساتھ نہیں بتا سکتے، کہ کوئی ذرہ کس طرح عمل کر رہا ہوگا''۔ (۱۳)

۱۶- ڈارون کا نظریہ بھی گذشتہ صدی کے مادہ اور مادیت کے ان تصورات کا شاخسانہ تھا، جواب اس صدی میں فرسودہ ہو چکے ہیں، اب اس کی حیثیت ایک افسانہ کی ہے، اس کا تعلق کسی منطق وعقلیت سے زیادہ مادہ پرستانہ ذہنیت سے ہے۔

۱۷- نفس انسانی کی مادی تعبیرات، اور نفس ودماغ کے تعلق کے پرانے دعوے بھی اب متروک ہوگئے ہیں، (Bernhard Bawink) ''برنہارڈ بے ونک'' کا کہنا ہے: ''اغلب یہ ہے کہ نہ نفس محض دماغ کا فعل ہے اور نہ دماغ نفس کا محض آلہ کار، بلکہ دونوں کسی نامعلوم تیسری (ذات وحقیقت) کے کارنامے ہیں، اور اس لئے دونوں باہم کسی نہ کسی طرح مربوط ووابستہ ہیں، کیوں کر وابستہ ہیں، یہ ہم نہیں جانتے''۔ (۱۴)

۱۸- مادی دنیا کے اس انقلاب نے کل تک حقائق سمجھے جانے والے کتنے مظاہر کو ناقابل تسلیم قرار دے دیا ہے، اور علم طبعیات میں کیسا انقلاب برپا کیا ہے، اس کے لئے ذرا برٹرینڈ رسل (Bertrand Russel) کی یہ تحقیق پڑھئے:

''طبعیات کی بنیاد پر آج جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں، وہ یہ کہ جس کو اب تک ہم اپنا جسم (Body) کہتے رہے ہیں، وہ درحقیقت بڑی دیدہ ریزی سے بنائی ہوئی ایک سائنسی ''تشکیل یا ڈھانچہ'' ہے، جس کے مطابق کوئی خارجی واقعی طبعیاتی حقیقت سرے سے پائی ہی نہیں جاتی۔

آج کا جدید مادہ پرست بننے کی کوشش کرنے والا اپنے کو عجیب کشمکش میں پاتا ہے، کیونکہ جہاں ایک طرف ایک خاص حد تک ذہن کے افعال کو کامیابی کے ساتھ جسم کے افعال کے ماتحت ثابت کرسکتا ہے، وہاں دوسری طرف اس واقعہ سے بھی مفر نہیں پاتا کہ جسم بجائے خود محض ذہن کا ایجاد کیا ہوا ایک سہولت پیدا کرنے والا تصور ہے''۔

اب آیئے ذرا اس کی سائنسی تشریح وتوجیہ کی ایک موٹی مثال لے لیں:۔

''سیدھا سادھا عام آدمی مادی چیزوں کے وجود کو یقینی پاتا ہے، کیونکہ وہ حواس کے لئے بالکل بیّن و بدیہی ہوتی ہیں، اور جو کچھ بھی مشکوک ہو، لیکن اتنا یقینی ہے کہ جس چیز کو تم ٹھوکر مارتے ہو، ڈھکیلتے دھکا دیتے ہو یا جس سے ٹکراتے ہو اس کو حقیقی و واقعی ہی ہونا چاہئے''

لیکن :۔

''علم طبعیات (فزکس) ثابت کر دیتا ہے کہ تم کبھی کسی چیز سے ہرگز ٹکراتے ہی نہیں، حتیٰ کہ جب تمہارا سر کسی پتھر کی دیوار سے ٹکراتا ہے، تو نفس الامری واقعہ و حقیقت کے اعتبار سے تم اس کو مس تک نہیں کرتے ہوتے...... ہوتا صرف یہ ہے کہ کچھ الکٹران اور پروٹان کے مابین جس کو تم سمجھتے ہو کہ چھو رہے ہو، صرف جذب و دفع کا عمل ہوتا ہے، لیکن اس عمل میں فی نفسہ دو جسموں میں کوئی لمس و اتصال نہیں پایا جاتا، محض اتنا ہوتا ہے کہ تمہارے جسم کے الکٹران اور پروٹان سے جب دوسرے جسم کے الکٹران اور پروٹان قریب ہوتے ہیں، تو ان میں ایک ہیجان پیدا ہوتا ہے، یہی ہیجان و اختلال تمہارے اعصاب کے واسطہ سے دماغ تک پہنچتا ہے، بس یہی دماغی تاثر لمس یا اتصال کا احساس پیدا کر دینے کے لئے ضروری ہوتا ہے:۔

۱۹۔ اب یہ کہا جاتا ہے کہ:۔

''جیسے ریاضی و ہندسہ میں الف، ب، ج وغیرہ حروف محض علامات (۱۵) ہوتے ہیں، ویسے ہی الکٹران، پروٹان وغیرہ طبعیات کے الف، ب، ج (A.B.C) ہیں''۔

اسی کو صف اول کے نامور سائنس داں آرتھر ایڈنگٹن کی زبان سے سن لیں کہ:۔

''طبعیات کا حاصل اب کچھ ریاضیاتی علامات (Symbols) اور ان کی مساواتیں (Equations) رہ گئی ہیں، یہ علامات کس شئی یا حقیقت کی ہیں، اس کا پر اسرار جواب یہ ہے کہ طبعیات کو اس سے مطلب نہیں، نہ اس کے پاس ان علامات کی تہہ میں جانے کا کوئی ذریعہ ہے''۔(۱۶)

آگے اور سن لیجئے:۔

''ان علامات یا آیات کے پس پردہ جو شئی کام کر رہی ہے اس کی حقیقت کے

متعلق کوئی قطعی حکم لگانا تو بہت دور رہا، طبعیات کو تو اس کے برعکس انتہائی قطعیت کے ساتھ اصرار ہے کہ اس کے طریقے (Methods) تو علامیت (Symbolism) کے پس پردہ کسی طرح جا ہی نہیں سکتے''۔(۱۷)

غرض:۔

''اس طرح طبعیات کی خارجی دنیا (External World) محض سایوں یا اظلال کی دنیا (World Of Shadows) بن کر رہ گئی''۔(۱۸)

اس لئے ''رسل'' کو کہنا پڑا:۔

''سائنس کی حالیہ ترقیوں نے ایک بہت بڑی تکلیف دہ اس صورت حال سے دوچار کر دیا ہے کہ ہر ترقی ہمارے علم کو اس سے بھی کم کر دیتی ہے، جتنا ہم پہلے حاصل سمجھتے تھے''۔(۱۹)

یعنی سائنس کی ہر جدید سے جدید ترقی،-فلسفیانہ یا مابعد الطبعیاتی حقائق اور اشیاء، یا بالفاظ دیگر عالم غیب سے تعلق اور اس کے علم کے اعتبار سے-ترقی معکوس ہوتی جارہی ہے یعنی علم کے بجائے جہل ہی جہل کی ترقی بنتی جارہی ہے---

''تاریخ سائنس'' نام کی ایک اور کتاب میں علم یا سائنس کی اس الٹی ترقی کو پڑھ لیں، جو علم کی ترقی کو جہل کی ترقی بتارہی ہے:۔

''علم کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا جارہا ہے، اتنا ہی عدم علم یا نامعلوم (Unknown) کا رقبہ بھی وسیع تر ہوتا جارہا ہے، اور جتنا زیادہ ہم نامعلوم میں گھستے ہیں، اتنا ہی جو کچھ وہاں ہم کو ملتا ہے، اس کو صاف وسادہ، قابل فہم الفاظ میں بیان کرنا دشوار ہوتا ہے''۔(۲۰)

مادہ کسی جامد حقیقت کا نام ہے، یہ خیال صدیوں تک دنیا کے ذہنوں پر مسلط رہا، لیکن یہ ایک واہمہ تھا، برٹرنڈ رسل کا کہنا ہے:۔

''کائنات کے تغیرات، یا اشیاء کے تغیر پذیر حوادث ومظاہر (Phenomena) کے پیچھے کسی متغیر قائم وثابت، ٹھوس یا جامد شے کے وجود کا اعتقاد، ان حوادث کی توجیہ وتشریح کے لئے کسی تجربی یا عقلی دلیل پر مبنی نہ تھا (Our Knowledge Of External World)

(ہمارا خارجی دنیا کا علم)۔(از برٹرنڈرسل ص ۸۵)

بلکہ رسل یہ بھی کہتا ہے کہ "کائنات نام ہے بس گذرنے والے واقعات کا، یہ واقعات اپنے "تعلیلی علائق" کے اعتبار سے مختلف مجموعوں میں رکھے جاسکتے ہیں"۔ دیکھئے (Will To Doubt)(ص ۸۳)

واقعات کی یہ اصطلاح "سر جیمز جینز (Sir James Jeans) برٹرنڈ رسل، ہنری برگسان (Bergson) وہائٹ ہڈ (White head) اور گاسٹن (Gaston Backelord) سب کے ہاں مشترک ہے۔

سر جیمز جینز نے اپنی کتاب (طبعیات وفلسفہ) میں اسکی یہ تعبیر نقل کی ہے:
"انسان کا علم وتجربہ بس وقوعات، یا وقوع پذیر چیزوں تک محدود ہے، جن کی درحقیقت نہ مزید کوئی توجیہ (Explanation) ہوسکتی ہے، نہ ترجمانی (Interpretation) نہ اس کی کوشش، دیکھئے (Milik Copex) کی کتاب (ص ۳۸۹)

"سائنس کے ناحل مسائل" (Unsolved Problems Of Scince) کا مصنف لکتا ہے:۔

"غرض سائنس کی انتہا بھی صرف اتنا ہی بتلاتی ہے کہ چیزیں عمل کیسے کرتی ہیں، نہ یہ کہ وہ بذات خود اپنی حقیقت میں کیا ہیں؟ اور نہ غریب سائنس مذہب کے باب میں کوئی رائے زنی کرسکتی ہے۔(۲۱)

برکلے کے نظریات نے مادیت (Meterialism) کو پس پشت ڈال کر تصوریت (Idealism) کا نظریہ پیش کیا، پھر نظریہ "اضافیت اور کوانٹم" نے پرانے مادی نقشہ کو تہہ وبالا کردیا، اور اس کے "اَبُوالاباء" ڈیکارٹ (Descartes Rene) قرار پائے، اور ڈیکارٹ کا نام لے کر اب "مادہ اور جسم" کے بجائے "نفس وذہن" کو اولیت کا مقام دیا جانے لگا، اور یہ کہا جانے لگا کہ انسان کو براہ راست یقین بلکہ بدیہی وحضوری علم صرف اپنے ہی نفس وذہن یا اس کے احساسات وافکار کا ہے، باقی خارجی اور مادی دنیا تمام تر محض قیاس واستنباطی ہے۔

شوپنہاور(Schopenhaur) نے تو محسوسات ومشاہدات ہی کیا، ریاضیاتی براہین کو مشکوک ومشتبہ ٹھہرادیا، وہ کہتا ہے:۔

''جن چیزوں کو میں آج تک اعلیٰ صداقت اور یقین پر مبنی جانتا رہا وہ یا تو براہ راست حواس یا ان ہی کی وساطت سے ماخوذ ہیں، لیکن حواس کبھی کبھی دھوکا بھی دیتے ہیں، اس لیے عقلمندی یہ ہے کہ جس شے سے ایک مرتبہ ہم دھوکا کھا چکے ہوں، اس پر پورا اعتماد نہ کریں، اقلیدس یا ہندسہ تک کی معمولی معمولی باتوں میں بعض آدمی دھوکا کھا جاتے ہیں، اور غلط قیاسات قائم کر لیتے ہیں، میں خود بھی اسی طرح غلطی کر سکتا ہوں، جس طرح دوسرے کرتے ہیں، لہٰذا میں نے تمام ان دلائل کو مشتبہ سمجھ کر رد کر دیا، جن کو پہلے براہین جان کر قبول کر لیا تھا، سب سے آخری شبہ یہ ہوتا ہے کہ جو خیالات ہمارے ذہن میں بیداری ملکی لحالت امیق پیدا ہوتے ہیں، بعینہٖ وہی خواب کی حالت میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں، بغیر اس کے کہ ان میں کوئی بھی صحیح ہو، اس لیے فرض کر لیتا ہوں کہ میرے تمام خیالات محض خواب کہ باتیں ہو سکتی ہیں''۔

مادی دنیا سے متعلق شکوک وشبہات نے انسان کو اپنی دریافت کی طرف متوجہ کر دیا، اور وہ ''ظاہر'' سے زیادہ ''باطن'' کو دیکھنے لگا۔

''نظریۂ اضافیت کے حالیہ اثرات کے تحت (سائنس میں بھی خارجی کے بجائے) داخلی (Subjective) یا ذہنی ضابطہ سازی (Formulation) ہی کا رجحان پیدا ہو گیا ہے'' (۲۲)

دوسری طرف سائنس کا محدود موضوع موجودات کی محض ظاہری حالت ہے:۔

''اس کو اس بات سے کوئی مطلب یا سرور کار نہیں کہ کوئی شئی بجائے خود کیا (یا کہاں ہے، ذہن میں ہے یا اس سے باہر) ہے؟ اس کو موجودات (Entities) کی محض ظاہری (Extrinsic) حقیقت یا نوعیت سے بحث ہوتی ہے، یعنی موجود یا کسی شئی کے دوسرے اشیاء کے ساتھ باہمی تعلق سے''۔ (۲۳)

ایک اور بات یہاں یہ ذکر کی گئی ہے کہ سائنسی معلومات مسلسل تغیر پذیر ہیں:۔

''سائنس، مذہب یا دینیات (تھیالوجی) سے بھی کہیں زیادہ تغیر پذیر یا ناپائدار

(Changing) ہوتی ہے، سائنس کا کوئی آدمی ''گلیلو'' یا ''نیوٹن'' کی باتوں کی غیر مشروط طور پر (یا بلا تعدیل وتحدید) تائید نہیں کرسکتا، نہ خود اپنے دس سال قبل والے سائنسی اعتقادات (Beliefs) کی''۔

وجہ بڑی اس کی یہی ہے کہ سائنس کا تعلق، انسان کے ناقص ومحدود اور لازماً ناپائدار علم وعقل سے ہے۔

''سائنس کی قدروقیمت'' نامی کتاب کے بالکل آخری صفحہ پر ڈیکارٹ (Descartes) مزید صراحت کے ساتھ کہتا ہے:۔

''وہ سب کچھ جو خیال نہ کیا جارہا ہو، لاشئی محض ہے، چونکہ ہم صرف خیال ہی کا خیال کر سکتے ہیں، اور تمام وہ الفاظ جو ہم اشیاء کے لیے استعمال کرتے ہیں، وہ صرف خیالات ہی خیالات کو ظاہر کر سکتے ہیں، اس لیے یہ کہنا کہ کوئی شئی نفس خیال کے علاوہ پائی جاتی ہے، ایک ایسا بے معنی دعویٰ ہے جس کے کوئی معنی نہیں ہوسکتے''۔

آگے خود ایڈنگٹن (Eddington) نے اپنی ایک دوسری کتاب ''نادیدہ دنیا'' (۲۴) کے دوسطری اقتباس سے ڈیکارٹ ہی کی طرح سائنسی طور پر خارجی وجود کے بجائے ذہن ہی کی اوّلیت ومرکزیت کو اس طرح مختصراً واضح کیا ہے کہ:۔

''ہم کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہمارے تجربہ میں آنے والی اولین یا سب سے پہلے اور سب سے براہِ راست شئے ذہن (Mind) ہی ہے، باقی اس کے ماسوا، یا ماوراجو کچھ بھی ہے، سب نرا استنباط (یا قیاس ہی قیاس) ہے''۔

ایڈنگٹن اپنی کتاب (سائنس اور نادیدہ دنیا) میں لکھتا ہے:۔

''مادیت یا مادہ پرستی اپنے لفظی معنی میں مدت ہوئی مرچکی ہے، آج کل دنیا میں ہر چیز کے (Manifestations) میں تحلیل ہو یا تحویل (Reduce) کرنے کا رجحان نہیں رہا ہے، کیونکہ طبعیات (فزکس) کی دنیا میں مادہ اب بہت گھٹیا (Minor Place) چیز رہ گئی ہے''۔

نامور محقق سائنس ''فلپ فرانک'' اپنی کتاب ''جدید سائنس اور اس کا فلسفہ''

(Modern Science And Its Philosophy) میں رقم طراز ہے:۔

''اضافیت کے طبعی (فزیکل) نظریہ نے ثابت کر دیا ہے کہ برقی مقناطیسی (Electro-Magnetic) قوتیں حقیقی قطعاً نہیں (Real at all are not) بلکہ محض خود ہمارے ذہن کی ساختہ پرداختہ ہیں (Constructins Of Our Own Mind Mere) اور یہی حال نیوٹن کی قوت کشش اور انرجی (Energy) وغیرہ تمام دوسرے ایسے تصورات (Concepts) کا ہے، کہ یہ سب محض ذہن کے خانہ ساز ہیں، اور خارجیت (یا ذہن سے خارج موجود ہونے) کے معیار پر پورے نہیں اترتے (They pass the test of Objectivity do not)۔

حد ہے کہ:۔

''اگر مادہ پرستوں کو یہ بتانے پر مجبور کیا جائے کہ اب وہ دنیا کے کتنے حصہ (Parts) کے مادی ہونے کا دعویٰ (Claim) رکھتے ہیں، تو ان کا ممکن جواب فقط یہ ہوگا کہ بس صرف مادہ، مادی ہے''۔

(Walter Grierson) اور (J.W.N.Sullivon) کی ''ماڈرن بلیف'' کے اس اقتباس پر غور کیجیے:۔

''سائنس کو اب اپنی رسائی کی محدودیت کا احساس زیادہ ہو گیا ہے، مظاہر کائنات کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جن تک سائنسی بحث و تحقیق جا ہی نہیں سکتی، لیکن اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ وہ پہلو نظر انداز کر دینے کے لائق ہیں، سائنس کے علاوہ مذہبی و جمالیاتی وجدانات کی سی علم کی دوسری قسمیں بھی ہیں، جن کو وہمی یا قیاسی کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔

''سائنسی علم ہی وہ سب کچھ نہیں جو ہم جانتے ہیں یا جس کا جاننا ہمارے لیے ضروری ہے، سائنس کا اپنی محدودیت کا یہ نیا شعور یا احساس انکسار آج کے سائنسی انقلاب کا ایک بڑا اہم عنصر یا نتیجہ ہے''۔

علت و معلول کے جبری سائنسی قانون کی شکست و ریخت نے ''اختیار انسانی'' کے

نظریہ اور عقیدہ کو سائنسی طور پر ثابت کر دیا ہے:۔

''اگر قطعی علیت (Strict Causality) کا مادی دنیا سے خاتمہ ہو چکا ہے جیسا کہ تمام قرائن اسی کے ہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہی ہو چکا ہے، تو اس پرانے مفروضہ سے ہم کو نجات مل جاتی ہے، کہ ذہن جبری (Determinatic) قانون کا تابع ہے''۔

ایڈنگٹن عدم جبریت (Indeterminacy) کو آج کی طبعی سائنس اور فلسفہ دونوں کا لازمہ جانتا ہے، اس کا علی الاعلان دعویٰ ہے کہ جو لوگ ذہنی افعال (Activity) کی جبریت کے قائل ہیں، بالفاظ دیگر ارادہ کی آزادی یا اختیار (Freedom Of Will) کے منکر ہیں، وہ اب اپنی تائید میں سائنس کی کوئی شہادت بالکل نہیں پیش کر سکتے، الکٹران جبری قوانین کے تابع قطعاً نہیں معلوم ہوتے''۔(۲۵)

سائنسی فلسفہ کے لیے تیسری سب سے اہم بات یہ ہے، کہ ایڈنگٹن بنیادی حقیقت، شعور (Consciousness) ہی کو قرار دیتا ہے۔

اور طبعیاتی (فزیکل) دنیا شعور کے زنجیرہ (Linkage) یا وابستگی سے قطع نظر کر کے، کوئی واقعیت (Actuality) ہی سرے سے نہیں رکھتی، ذہن ہی ہمارے تجربہ کی سب سے پہلی اور سب سے براہ راست چیز ہے، اس لیے ماسوا جو کچھ بھی ہے، سب دور افتادہ استنباط ہی استنباط یا قیاس ہی قیاس''۔

بہر حال ''مادیت'' دھیرے دھیرے ذہن و دماغ کی ساختہ پرداختہ پیمائشیں ہی رہ گئیں۔

۱۹۵۸ء کی ایک کتاب ''سائنس اور جدید ذہن'' (۲۶) پر ''عصری سائنس اور دنیا کا عصری تصور''، ''فلپ فرانک'' کا ایک مقالہ پورا پڑھنے والا ہے، موصوف کی شخصی و سائنسی عظمت کے لئے یہی کافی ہے کہ ہارورڈ یونیورسٹی میں ''آئنسٹائن'' کے جانشین رہے ہیں، اور اب خصوصی طور پر کولمبیا یونیورسٹی میں فلسفۂ سائنس ہی پر لکچر دے رہے ہیں، ان کے مذکورہ بالا مقالہ کے چند جستہ جستہ مختصر اقتباسات بھی پڑھ لیں:۔

''ہماری صدی میں نظریۂ اضافیت کی تعبیر و ترجمانی اکثر فلسفۂ تصوریت کے رنگ میں

کی جاتی ہے، کیونکہ طبعیات (فزکس) کسی جسم کی (مثلاً) حقیقی لمبان تک کا نام نہیں لے سکتی (کہ وہ بجائے خود واقعتاً کتنا لمبا ہے۔) بلکہ کسی خاص فرد مشاہد (Observer) کے انفرادی مشاہدہ (Observation) ہی کا نام لے سکتی ہے، جس کے معنی یہ ہوتے ہیں، کہ طبعیاتی سائنس کا تعلق مادی اشیاء (Objects) کے بجائے ذہنی مظاہر واحوال (Phenomena) سے ہے"۔

اسی طرح کوانٹم نظریہ کی رو سے:۔

"عالمِ طبعیات، ذرات (Particles) کے واقعی یا خارجی (Objective) وضع ومحل (Position) یا مدار (Orbit) نہیں بتلاتا بلکہ صرف مشاہدہ کرنے والے کے خاص حالات وعوارض (Circumstances) کی بنائی ہوئی یا ساختہ پرداختہ پیمائشوں (Measurements) کو بتاتا ہے"۔

☆☆☆

واقعہ یہ ہے کہ سائنسی دنیا مادیت کی سرنگ میں سفر کرتے کرتے "تصوریت" کی مجہول دنیا میں پہونچ چکی ہے، بڑے بڑے اساطین سائنسدان اب یہ اعتراف کرتے ہیں، ذیل میں ان کے اعترافات پڑھئے:

"۱-سر جیمس جینز (Sir James Jeans) :۔میرا رجحان "تصور" کے اس نظریہ کی طرف ہے کہ شعور اساسی حقیقت ہے، اور مادی کائنات اس سے ماخوذ (Derived) ہے۔

۲-ماکس پلانک (Max Planck):۔شعور کی توجیہ مادہ اور اس کے قوانین سے نہیں ہوسکتی، میرے نزدیک اساسی حقیقت شعور ہی ہے، اور مادہ کو شعور سے ماخوذ خیال کرتا ہوں، جس شئی کی نسبت ہم کچھ کہتے یا سنتے یا جس کو موجود جانتے ہیں، اس کے لئے پہلے شعور کا فرض کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

۳-پروفیسر شروڈنگر (Schrodinger):۔زندگی تو میرے نزدیک ہوسکتا ہے کہ کسی اتفاق کا نتیجہ ہو، لیکن شعور کی نسبت میں ایسا نہیں خیال کرتا، شعور کی توجیہ طبعی طریقوں سے ناممکن ہے، کیونکہ شعور قطعی طور پر ایسی اساسی حقیقت ہے، جس کی کسی دوسری

شئی سے توجیہ نہیں ہوسکتی۔

۴-پروفیسر ہالڈین (Haldane):۔اگر ہم شعور کی بھی اسی طرح توجیہ کرنا چاہیں جس طرح طبعیاتی یا حیاتیاتی واقعات ومظاہر کی کرتے ہیں، تو یہ کوشش بالکلیہ ناکام رہتی ہے۔

۵-سر آرتھر ایڈنگٹن :۔ باطنی ایگو (انا) کسی طرح بھی طبعی کائنات کا جز نہیں ہوسکتا، الاآنکہ لفظ طبعی کے سرے سے معنی ہی بدل کر روحانی (Spiritual) کردیں۔

۶-آئنسٹائن (Einstein) کی رائے میں بھی نفس وشعور اساسی حقیقت ہے"(۲۷)

سائنسی دنیا کے ماہروں نے "جوہر" (Atom) کی تلاش اور اس کے ادراک کی کوشش میں آخر اس منزل پر سپر ڈال دی کہ یہ سب کچھ کسی ایک ذہن، "ایک خلاق" کی کارفرمائی ہے، ہمارا شعور اس کے شعور کا عکس ہے، اور بس:

"سر جیمس جینز سائنسی راہ سے اسی نتیجہ پر پہونچتا ہے، جس پر برکلے خالص فلسفیانہ فکری راہ سے پہنچا تھا، کہ آسمان وزمین کے سارے اجرام واجسام، ذہن کے باہر کوئی وجود قطعاً نہیں رکھتے، جب تک میں فی الواقع ان کا ادراک نہیں کرتا ہوتا، یا میرے ذہن میں پائے نہیں جاتے، یا میری ہی طرح کسی دوسری مخلوق روح کے ذہن میں، اس وقت تک یا تو ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ممکن، یا پھر کسی ابدی روح (Eternal Spirit) کے ذہن میں موجود یا اس کے ساتھ قائم (Subsist) ہونا چاہئیں"۔

غرض:۔"انتہائی حقیقت ایک اور صرف ایک ہے،، ابدی وکلی روح یا ذہن--- باقی سب اس ذہن یا شعور سے وابستہ اس کی ذہنی مخلوقات ہیں"۔

"انتہائی واحد حقیقت ذہن ہی ذہن ہے، اور کائنات عظیم مشین نہیں، عظیم فکر (Thought) ہے، اور ادراک (Perceiving) وفکر (Thinking) اس ذہن کی فعالیت، یا زیادہ صحیح معنی میں خلاّقیت کا ظہور ہے"۔(۲۸)

مادیت کی اس شکست کے نتیجہ میں اشتراکیت کی جدلی مادیت کا بھی سائنسدانوں کے ذریعہ یوں جنازہ نکال دیا گیا، کہ جیمس بی کوناٹ (James B. Conaut) اپنی کتاب

- (جدید سائنس اور جدید انسان) (Modern Science And Modern Man) میں لکھتا ہے کہ:۔

''(اشتراکیت) کی یہ جدلیاتی مادیت فلسفیانہ طور پر خالص احمقانہ اور سراسر مہمل ہی مہمل ہے'' (ص ۵۵-۱۶۰)

اس کا یہ نتیجہ تھا کہ ''برنہارڈ بیونک'' (Bernhard bawnk) نے سائنس کی دنیا میں ''مذہب وسائنس سے مصالحت'' کے فروغ سے متاثر ہو کر اپنی کتاب کا نام یوں رکھا ''جدید سائنس مذہب کے راستہ پر'' (Modern Science On The Path Of Religion)

خلاصہ یہ کہ اس کائنات کا مبدء وجود، سرے سے اندھے بہرے علم وارادہ مادہ یا ہمارے جزئی وانفرادی ناقص وفانی ذہن کے بجائے خود سائنس کی رہنمائی میں اعلیٰ وابدی کلی ذہن یا مذہب کی زبان میں خدا کو تسلیم کرنے کے بعد لازماً اس کی ذات وصفات اور اس کی پیدا کی ہوئی اس کائنات اور اس کے مقصد ومقام کے غیبوں کا قابل اعتماد علم، وہی اور اتنا ہی ہوگا، جو اور جتنا خود وہ کسی ذریعہ سے دیدے، اسی ذریعہ وواسطہ کا نام، مذہب کی زبان میں ''وحی ونبوت'' ہے۔

اب یہ سائنسی حقیقت ہے کہ ''ارسطو'' کا ہیولی، جو مسلمان فلسفیوں کے سروں پر مدتوں بھوت کی طرح سوار رہا، اور آج بھی قدیم فلسفہ والے اس کی جاہلانہ رٹ لگاتے رہتے ہیں، اور دیمقراطیس کے اجزاء اور جزءلایتجزی، اور برکلے کا مادہ، اور جان اسٹورٹ مل کی برکلے کی مداحی، اور جان ڈالٹن کا ایٹم''، جس کے خلاف سننے سے گریز کے لئے سائنس نے اپنے کانوں میں ڈاٹیں ٹھونس رکھی تھیں، اب ماضی کا قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔

اصل یہ ہے کہ خود سائنس کے پاس نہ اب نام نہاد مادہ کا کوئی خارجی (Objective) وجود رہا ہے نہ مکان وزمان کا، حد یہ ہے زمانہ یا وقت کے بے آغاز (Less-Beginning) ہونے تک کو چیلنج کیا جا چکا ہے، یعنی کوئی زمانہ ایسا بھی تھا کہ خود زمانہ ہی سرے سے نہ پایا جاتا تھا، بات پتہ کی اور لے دے کر سمجھ میں آنے والی وہی ہے، کہ یہ ذہن

سے باہر خارجی موجودات بھی بس یا تو سراسر ہمارے ذہن کی تجریدات ہیں، یا پھر ان کا مستقل ازلی وابدی وجود ہماری طرح کے کسی ازلی وابدی، یا بقول سرجیمس جینز (Jeans) عالمگیر کائناتی ذہن (Universal Mind) یا بقول ''برکلے'' ''برتر روح یا خدا'' میں ہے۔

اخیر میں اس کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ سائنس دانوں کے نام اور بہت زیادہ ان کے ایجادی واکتشافی کام ہمارے لیے ایسے مرعوب کن ہو گئے ہیں، کہ ان کے نام وکام کو سنتے دیکھتے ہی، ان کی ہر بات پر ایمان کے سوا گویا چارہ ہی نہیں پاتے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس داں نوعی طور پر کسی امیر کبیر شاہ وشہنشاہ کے ماہر باورچی سے زیادہ نہیں (۲۹)، یا دوسرے کسی استاد فن بڑھئی، لہار، سنار وغیرہ کی سی حیثیت رکھتے ہیں''۔

مشکل یہ ہے کہ دنیا مظاہر میں گم ہے، اور اسے آنکھوں اور خوردبینوں سے دیکھنا چاہتی ہے، جس کے نوری حجابات اسے مستور ہی رکھے ہوئے ہیں۔

بقول علامہ اقبال:

حکیم وعارف وصوفی تمام مست ظہور
کسے خبر کہ تجلّی ہے عین مستوری

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ، يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ (سورہ مائدہ:۱۵-۱۶)

ترجمہ: تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشن اور واضح کتاب آ گئی ہے، جس سے اللہ ان لوگوں کو سلامتی کے راستوں کی ہدایت ورہنمائی عطا فرما رہا ہے، جو اس کی خوشنودی اور رضامندی کی باتوں کی پیروی کرتے ہیں، اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر اپنے حکم سے روشنی میں لا رہا ہے، اور ان کو صراط مستقیم کی طرف لے جا رہا ہے، اور اس پر استقامت عطا فرما رہا ہے۔

☆☆☆

اس موقعہ پر سائنس کی حقائق تک نارسائی، اور مذہب حق کی ضرورت، اور انسان کے اندر اس کی روحانی پیاس، اور سائنسدانوں کے اندر مطالعہ کائنات سے حیرت وسر گشتگی کی کیفیت کے ثبوت کے لئے، سر جیمز جینس (Sir James Jeans) کا ایک واقعہ ذکر کر دینا کافی ہے، جس کو مولانا وحید الدین صاحب نے اپنی کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' میں ذکر کیا ہے، مولانا کہتے ہیں:

یہاں میں ایک واقعہ نقل کروں گا جس کے راوی علامہ عنایت اللہ مشرقی ہیں، اور اس کا تعلق انگلستان سے ہے:

''۱۹۰۹ء کا ذکر ہے، اتوار کا دن تھا، اور زور کی بارش ہو رہی تھی، میں کسی کام سے باہر نکلا تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس (james jeans) پر نظر پڑی جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے، میں نے قریب ہو کر سلام کیا، انھوں نے کوئی جواب نہ دیا، دوبارہ سلام کیا تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے، ''تم کیا چاہتے ہو'' میں نے کہا، دو باتیں اول یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے، سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا، دوم یہ کہ آپ جیسا شہرۂ آفاق آدمی گرجا میں عبادت کے لئے جا رہا ہے، یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز لمحہ بھر کے لئے رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا'' آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو'' چنانچہ میں شام کو ان کی رہائش گاہ پہنچا، ٹھیک چار بجے لیڈی جیمز باہر آ کر کہنے لگیں'' سر جیمز تمہارے منتظر ہیں '' اندر گیا تو ایک چھوٹی سی منبر پر چائے لگی ہوئی تھی، پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے، کہنے لگے'' تمہارا سوال کیا تھا'' اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اجرام آسمانی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام، بے انتہا پنہائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریا و جبروت پر دہلنے لگا، اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے، آنکھوں سے حیرت وخشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں، اللہ کی حکمت و

دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے،اور آواز لرز رہی تھی،فرمانے لگے ''عنایت اللہ خان! جب میں خدا کی تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے، اور جب کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہوکر کہتا ہوں ''تو بہت بڑا ہے'' تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہم نوا بن جاتا ہے، مجھے بیحد سکون وخوشی نصیب ہوتی ہے، مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے، کہو عنایت اللہ خان! تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں''۔

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کردیا، میں نے کہا ''جناب والا! میں آپ کی روح افروز تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں، اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آگئی اگر اجازت ہو تو پیش کروں، فرمایا ''ضرور'' چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی:۔

﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (سورہ فاطر:۱۷-۱۸)

اور پہاڑوں کے الگ الگ حصے ہیں، سفید، سرخ، مختلف رنگ کے اور کالے بھجنگ (۲۷) اسی طرح انسانوں، جانوروں، چوپاؤں میں الگ الگ رنگ، اور قسمیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی خشیت اللہ کے بندوں میں سے اہل علم میں ہوتی ہے، (جو ان حقائق کائنات پر تدبر کرتے ہیں اور ان کو معرفتِ الٰہی کا ذریعہ بناتے ہیں)۔(۲۸)

یہ آیت سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے:۔

''کیا کہا- اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں، حیرت انگیز، بہت عجیب، یہ بات جو مجھے پچاس برس مسلسل مطالعہ ومشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی، محمد ﷺ کو کس نے بتائی، کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے، اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے،

محمد ﷺ ان پڑھ تھا، اسے یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی، اسے یقیناً اللہ نے بتائی تھی، بہت خوب، بہت عجیب......'' (نقوش، شخصیات نمبر)

واقعہ یہ ہے کہ چودہ سال پہلے خالق کائنات نے اپنی آخری کتاب میں جو فرما دیا تھا کہ: ﴿سنريهم آياتنا في الآفاق و في انفسهم حتى يتبين لهم أنه الحق﴾

(ہم آگے چل کر انہیں اپنی نشانیاں فضائے بسیط میں اور خود ان کی ذات میں دکھائیں گے، یہاں تک کہ یہ بات بالکل کھل کر سامنے آجائے گی کہ اللہ برحق ہے)۔

اس کا یہ ظہور ہے، اب آیئے خالق ارض و سموات کی اس عظیم کائنات پر ایک نظر ڈال لیجئے:۔

فلکیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے جتنے ذرے ہیں، شاید اسی قدر آسمان میں ستارون کی تعداد ہے، ان میں کچھ ستارے ایسے ہیں، جو زمین سے کسی قدر بڑے ہیں، مگر بیشتر ستارے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے اندر لاکھوں زمینیں رکھی جا سکتی ہیں، اور بعض ستارے تو اس قدر بڑے ہیں کہ اربوں زمینیں ان کے اندر سما سکتی ہیں، یہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ روشنی کی مانند ایک انتہائی ممکن حد تک تیز اڑنے والا ہوائی جہاز جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ ہو، وہ کائنات کے گرد گھومے تو اس ہوائی جہاز کو کائنات کا پورا چکر لگانے میں تقریباً ایک ارب سال لگیں گے پھر اتنی وسعت کے باوجود یہ کائنات ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ ہر لمحہ اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے، اس پھیلنے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہر ۱۳۰ کرور سال کے بعد کائنات کے تمام فاصلے دگنے ہو جاتے ہیں، اس طرح ہمارا یہ خیالی قسم کا غیر معمولی تیز رفتار ہوائی جہاز بھی کائنات کا چکر کبھی پورا نہیں کر سکتا، وہ ہمیشہ اس بڑھتی ہوئی کائنات کے راستہ میں رہے گا۔ (۳۰)

آسمان گرد و غبار سے پاک ہو تو پانچ ہزار ستارے خالی آنکھ سے دیکھے جا سکتے ہیں لیکن معمولی دوربینوں کی مدد سے یہ تعداد بیس لاکھ سے زیادہ ہو جاتی ہے، اس وقت کی سب سے بڑی دوربین جو ماؤنٹ پیلومر پر لگی ہوئی ہے، اس سے اربوں ستارے نظر آتے ہیں، مگر یہ

تعداد اصل تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے، کائنات ایک بے انتہا وسیع خلا ہے، جس میں لاتعداد ستارے غیر معمولی رفتار سے مسلسل حرکت کر رہے ہیں، کچھ ستارے تنہا سفر کر رہے ہیں، کوئی دو یا زیادہ ستاروں کے مجموعوں کی شکل میں ہیں اور بے شمار ستارے ایسے ہیں، جو مجامع النجوم کی صورت میں متحرک ہیں، روشن دان سے کمرے میں آنے والی روشنی کے اندر آپ نے بیشمار ذرے اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے دیکھے ہوں گے اسی کو اگر آپ بہت بڑے پیمانے پر قیاس کر سکیں تو کائنات کے اندر ستاروں کی گردش کا آپ ہلکا سا اندازہ کر سکتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ ذرے باہم ملے ہوئے حرکت کرتے ہیں، اور ستارے تعداد کی اس کثرت کے باوجود بالکل یکہ وتنہا دوسرے ستاروں سے بے اندازہ فاصلے پر سرگرم سفر ہیں، جیسے وسیع سمندروں میں چند جہاز جو ایک دوسرے سے اتنی دوری پر چل رہے ہوں کہ انھیں ایک دوسرے کی خبر نہ ہو۔

یہ ساری کائنات ستاروں کے بے شمار جھرمٹوں کی صورت میں ہے، ہر جھرمٹ کو کہکشاں کہتے ہیں، اور یہ سب کے سب مسلسل حرکت میں ہیں، سب سے قریبی حرکت جس سے ہم واقف ہیں، وہ چاند ہے، چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور رہ کر اس کے گرد مسلسل اس طرح گھوم رہا ہے کہ ہر ساڑھے انتیس دن میں زمین کے گرد اس کا ایک چکر پورا ہو جاتا ہے، اسی طرح ہماری زمین جو سورج سے ساڑھے نو کرور میل دور ہے، وہ اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہوئی سورج کے گرد انیس کرور میل کا دائرہ بناتی ہے، جو ایک سال میں پورا ہوتا ہے، اسی طرح زمین سمیت نو سیارے ہیں، اور وہ سب کے سب سورج کے گرد مسلسل دوڑ رہے ہیں، ان سیاروں میں بعید ترین سیارہ پلوٹو ہے جو ساڑھے سات ارب میل کے دائرہ میں چکر لگا رہا ہے، یہ تمام سیارے اپنے سفر میں اس طرح مصروف ہیں کہ ان کے گرد اکتیس چاند بھی اپنے اپنے سیاروں کے گرد گھوم رہے ہیں، ان کے علاوہ تیس ہزار چھوٹے سیاروں (Asteroids) کا ایک حلقۂ ہزاروں دم دار ستارے اور لاتعداد شہاب ثاقب ہیں جو اسی طرح گردش میں مصروف ہیں، ان سب کے بیچ میں وہ ستارہ ہے، جس کو ہم سورج کہتے ہیں، اور جس کا قطر آٹھ لاکھ ۶۵ ہزار میل ہے،

۔ اور وہ زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔

یہ سورج خود بھی رکا ہوا نہیں ہے بلکہ اپنے تمام سیاروں اور سیارچوں کو لئے ہوئے ایک عظیم کہکشانی نظام کے اندر چھ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کر رہا ہے، اسی طرح ہزاروں حرکت کرتے ہوئے نظام ہیں جن سے مل کر ایک کہکشاں وجود میں آتی ہے، کہکشاں گویا ایک بہت بڑی پلیٹ ہے، جس پر بے شمار ستارے منفرداً اور مجتمعاً لٹوؤں کی طرح مسلسل گھوم رہے ہیں، پھر یہ کہکشائیں خود بھی حرکت کرتی ہیں، چنانچہ وہ قریبی کہکشاں جس میں ہمارا شمسی نظام واقع ہے، وہ اپنے محور پر اس طرح گردش کر رہی ہے کہ اس کا ایک دور بیس کرور سال میں پورا ہوتا ہے۔

علمائے فلکیات کے اندازے کے مطابق کائنات پانچ سو ملین، (ایک ملین برابر دس لاکھ) کہکشانوں پر مشتمل ہے، اور ہر کہکشاں میں ایک لاکھ ملین یا اس سے کم وبیش ستارے پائے جاتے ہیں، قریبی کہکشاں جس کے ایک حصے کو ہم رات کے وقت سفید دھاری کی شکل میں دیکھتے ہیں، اس کا رقبہ ایک لاکھ سال نور ہے، اور ہم زمین کے رہنے والے کہکشاں کے مرکز سے تیس ہزار نوری سال کے بقدر دور ہیں، پھر یہ کہکشاں ایک اور بڑی کہکشاں کا جزو ہے، جس میں اسی طرح کی سترہ کہکشائیں حرکت کر رہی ہیں، اور پورے مجموعہ کا قطرہ بیس لاکھ سال نور ہے۔

ان تمام گردشوں کے ساتھ ایک اور حرکت جاری ہے، اور وہ یہ کہ ساری کائنات غبارے کی طرح چاروں طرف پھیل رہی ہے، ہمارا سورج ہیبت ناک تیزی کے ساتھ چکر کھاتا گھومتا ہوا بارہ میل فی سکنڈ کی رفتار سے اپنی کہکشاں کے بیرونی حاشیے کی طرف مسلسل بھاگ رہا ہے، اور اپنے ساتھ نظام شمسی کے تمام توابع کو بھی لئے جا رہا ہے اسی طرح تمام ستارے اپنی گردش کو قائم رکھتے ہوئے کسی نہ کسی طرف کو بھاگ رہے ہیں، کسی کے بھاگنے کی رفتار آٹھ میل فی سکنڈ ہے، کسی کی ۳۳ میل فی سکنڈ کسی کی ۸۴ میل فی سکنڈ، اسی طرح تمام ستارے انتہائی تیزی رفتاری کے ساتھ دور بھاگے چلے جا رہے ہیں۔

یہ ساری حرکت حیرت انگیز طور پر نہایت تنظیم اور باقاعدگی کے ساتھ ہو رہی ہے، نہ ان میں باہم کوئی ٹکراؤ ہوتا اور نہ رفتار میں کوئی فرق پڑتا، زمین کی حرکت سورج کے گرد ہر درجہ منضبط ہے، اسی طرح اپنے محور کے اوپر اس کی گردش اتنی صحیح ہے کہ صدیوں کے اندر بھی اس میں ایک سکنڈ کا فرق نہیں آنے پاتا، زمین کا سیارہ جس کو چاند کہتے ہیں، اس کی گردش بھی پوری طرح مقرر ہے، اس میں جو تھوڑا سا فرق ہوتا ہے، وہ بھی ہر ساڑھے اٹھارہ سال کے بعد نہایت صحت کے ساتھ دہرا دیا جاتا ہے، یہی تمام اجرام سماوی کا حال ہے، حتیٰ کہ ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق اکثر خلائی گردش کے دوران ایک پورا کہکشانی نظام، جو اربوں متحرک ستاروں پر مشتمل ہوتا ہے، دوسرے کہکشانی نظام میں حرکت کرتا ہوا داخل ہوتا ہے، اور پھر اس سے نکل جاتا ہے، مگر باہم کسی قسم کا ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا اس عظیم اور حیرت انگیز تنظیم کو دیکھ کر عقل کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ اپنے آپ نہیں قائم ہے بلکہ کوئی غیر معمولی طاقت ہے، جس نے اس اتھاہ نظام کو قائم رکھا ہے۔

یہی ضبط و نظم جو بڑی دنیاؤں کے درمیان نظر آتا ہے، وہی چھوٹی دنیاؤں میں بھی انتہائی مکمل شکل میں موجود ہے، اب تک کی معلومات کے مطابق سب سے چھوٹی دنیا ایٹم ہے، ایٹم اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ کسی بھی خوردبین سے نظر نہیں آتا، حالانکہ جدید خوردبین کسی چیز کو لاکھوں گنا بڑھا کر دکھانے کی صلاحیت رکھتی ہے، ایٹم کی حقیقت انسانی قوت بصارت کے اعتبار سے ''لاشئے'' سے زیادہ نہیں، مگر اس انتہائی چھوٹے ذرے کے اندر حیرت انگیز طور پر ہمارے شمسی نظام کی طرح ایک زبردست گردشی نظام موجود ہے، ایٹم برق پاروں کے ایک مجموعے کا نام ہے، مگر یہ برق پارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ان کے درمیان ایک طویل خلائی حجم ہوتا ہے، سیسہ کا ایک ٹکڑا، جس میں ایٹمی ذرات کافی سختی اور مضبوطی کے ساتھ آپس میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں، یہ برق پارے حجم کے سوکرور حصوں میں سے ایک حصہ بھی مشکل سے گھیرتے ہیں، بقیہ حصے بالکل خالی ہوتے ہیں، اگر الکٹرون اور پروٹون کی دو ٹکڑوں کی حیثیت سے تصور بنائی جائے تو دونوں کا درمیانی فاصلہ تقریباً ۳۵۰ گز

ہوسکتا ہے یا ایٹم کا تصور گرد کے ایک غیر مرئی ذرہ کی حیثیت سے کیا جائے تو الکٹرون کی گردش سے جو حجم بنتا ہے، اس کی مقدار ایک ایسے فٹ بال کی سی ہوسکتی ہے، جس کا قطر آٹھ فٹ ہو۔

ایٹم کے منفی برق پارے جو الکٹرون کہلاتے ہیں، وہ مثبت برق پارے کے گرد گھومتے ہیں، جن کو پروٹون کہا جاتا ہے، یہ برقیے، جو روشنی کی کرن کے ایک موہوم نقطہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے، اپنے مرکز کے گرد اسی طرح گردش کرتے ہیں، جیسے زمین اپنے مدار پر سورج کے گرد گردش کرتی ہے، اور یہ گردش اتنی تیز ہوتی ہے کہ الکٹرون کا کسی ایک جگہ تصور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے، گویا وہ پورے مدار پر ایک ہی وقت میں ہر جگہ موجود ہے، وہ اپنے مدار پر ایک سکنڈ ہزاروں ارب چکر لگا لیتا ہے۔

یہ ناقابل قیاس اور ناقابل مشاہدہ تنظیم اگر سائنس کے قیاس میں اس لئے آجاتی ہے کہ اس کے بغیر ایٹم کے عمل کی توجیہ نہیں کی جاسکتی تو ٹھیک اسی دلیل سے آخر ایک ایسے ناظم کا تصور کیوں نہیں کیا جاسکتا جس کے بغیر ایٹم کی اس تنظیم کا برپا ہونا محال ہے۔

ٹیلی فون کی لائن میں تاروں کا پیچیدہ نظام دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے ہم کو تعجب ہوتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ لندن سے ملبورن کے لئے ایک کال چند منٹ میں مکمل ہوجاتی ہے، مگر یہاں ایک اور مواصلاتی نظام ہے، جو اس سے کہیں زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، یہ ہمارا اپنا عصبی نظام (Nerve Cells) ہیں، جو قدرت نے قائم کر رکھا ہے، اس مواصلاتی نظام پر رات دن کروروں خبریں ادھر سے ادھر دوڑتی رہتی ہیں، جو دل کو بتاتی ہیں کہ وہ کب دھڑکے، مختلف اعضا کو حکم دیتی ہیں کہ وہ کب حرکت کریں، پھیپھڑے سے کہتی ہیں کہ وہ کیسے اپنا عمل کرے، اگر جسم کے اندر یہ مواصلاتی نظام نہ ہو تو ہمارا پورا وجود منتشر چیزوں کا مجموعہ بن جائے جن میں سے ہر ایک الگ الگ اپنے راستے پر چل رہا ہو۔

اس مواصلاتی نظام کا مرکز انسان کا بھیجا ہے، آپ کے بھیجے کے اندر تقریباً ایک ہزار ملین عصبی خانے (Nerve Cells) ہیں، ہر خانے سے بہت باریک تار نکل کر تمام جسم کے اندر پھیلے ہوتے ہیں جن کو عصبی ریشے (Nerve Fibers) کہتے ہیں، ان پتلے ریشوں

پر خبر وصول کرنے اور حکم بھیجنے کا ایک نظام تقریباً ستر (۷۰) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا رہتا ہے، انھیں اعصاب کے ذریعہ ہم چکھتے ہیں، سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، اور سارا عمل کرتے ہیں، زبان میں تین ہزار ذائقے خانے (Test Buds) ہیں، جن میں ہر ایک اپنے علیحدہ عصبی تار کے ذریعہ دماغ سے جڑا ہوا ہے، انھیں کے ذریعہ وہ ہر قسم کے مزوں کو محسوس کرتا ہے، کان میں ایک لاکھ کی تعداد میں سماعت خانے ہوتے ہیں، انھیں خانوں سے ایک نہایت پیچیدہ عمل کے ذریعہ ہمارا دماغ سنتا ہے، ہر آنکھ میں ۱۳۰ ملین (Light Receptors) ہوتے ہیں جو تصویری مجموعے دماغ کو بھیجتے ہیں، ہماری تمام جلد میں حسیاتی ریشوں کا ایک جال بچا ہوا ہے، اگر ایک گرم چیز جلد کے سامنے لائی جائے تو تقریباً ۳۰ ہزار "گرم خانے" اس کو محسوس کر کے فوراً دماغ کو اس کی خبر دیتے ہیں، اسی طرح جلد میں دو لاکھ پچاس ہزار خانے ایسے ہیں، جو سرد چیزوں کو محسوس کرتے ہیں، جب کوئی سرد چیز جسم سے ملتی ہے تو دماغ اس کی خبروں سے بھر جاتا ہے، جسم کانپنے لگتا ہے، جلد کی رگیں پھیل جاتی ہیں، فوراً مزید خون ان رگوں میں دوڑ کر آتا ہے تاکہ زیادہ گرمی پہونچائی جاسکے، اگر ہم شدید گرمی سے دوچار ہوں تو گرمی کے مخبرین دماغ کو اطلاع کرتے ہیں، اور تین ملین پسینہ کے غدود (Glands) ایک ٹھنڈا عرق خارج کرنا شروع کرتے ہیں۔

عصبی نظام کی کئی تقسیمیں ہیں، ان میں سے ایک (Autonomic Branch) ہے، یہ ایسے افعال انجام دیتی ہے، جو خود بخود جسم کے اندر ہوتے رہتے ہیں، مثلاً ہضم، سانس لینا اور دل کی حرکت وغیرہ، پھر اس عصبی شاخ کے بھی دو حصے ہیں ایک کا نام ہے مشارک نظام (Sympathetic System) جو کہ حرکت پیدا کرتا ہے، اور دوسرا (Parasympathetic) ہے، جو روک کا کام کرتا ہے، اگر جسم تمام تر پہلے کے قابو میں چلا جائے تو مثال کے طور پر، دل کی حرکت اتنی تیز ہو جائے کہ موت آجائے، اور اگر بالکل دوسرے کا اختیار ہو جائے تو دل کی حرکت ہی رک جائے، دونوں شاخیں نہایت صحت کے ساتھ مل کر اپنا اپنا کام کرتی ہیں، جب دباؤ کے وقت فوری طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو

(Sympathetic) کوغلبہ حاصل ہو جاتا ہے، اور دل اور پھیپھڑے تیزی سے کام کرنے لگتے ہیں، اسی طرح نیند کے وقت (Parasymapathetic) کا غلبہ ہوتا ہے، جب کہ وہ تمام جسمانی حرکتوں پر سکوت طاری کر دیتا ہے۔

☆☆☆
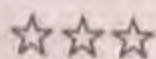
﴿فبأی حدیث بعده یؤمنون﴾

ان حقائق کے علم کے بعد کونسا انسان ہے جس کے اندر سے پھر وہ ایمان کا فوارہ نہ ابلنے لگے اور قادر مطلق رب کے سامنے سر بسجود نہ ہو جائے۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمین۔

حواشی

(۱) فلاسفی اینڈ ماڈرن سائنس مصنفہ Amenable طبع ثانی، ص:۴۳۳۔

(۲) تفصیلی حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو: نظام صلاح واصلاح، ص:۱۱۶، از راقم ہذا

(۳) Light Years۔

(۴) ماڈرن بلیف حصہ اول، ص:۱۵ و ۱۶ ملخصاً

(۵) رسالہ "سائنس" جولائی و اگست ۴۵ء حیدر آباد۔

(۶) یہ کتاب بالا "فرد اور کائنات" سے ص: ۷ تک کے جستہ جستہ اقتباسات ہیں۔

(۷) پوری کائنات مادی الکٹران یا منفی برق کی وحدات سے بنی ہوئی ہے، جسکا مرکز (Nucleas) برق کی مثبت وحدات "پروٹان" اور غیر برقی ذرات "نیوٹران" پر مشتمل ہوتا ہے۔

(۸) پروٹان کی جسمانیت ہائیڈروجن کے "سالمہ" کی ار فی لاکھ دریافت ہوئی ہے۔

(۹) (ہماری دنیا اور اس کی شروعات) Our World and Its Beginnings" by Gousalaw Fochler Hauke)، ص:۲۳ مطبوعہ روڈہام پریس لندن۔

(۱۰) (Nature of the world) حصہ اول، ص:۱۶۔

(۱۱) ماڈرن بلیف، حصہ ۱۴، ص: ۷۷۷۔

(۱۲) ماڈرن بلیف، حصہ ۱۴، ص: ۷۷۸-۷۷۹

(۱۳) Unsolved Problems of Science (سائنس کے ناحل مسائل) مصنفہ ہاسٹل

(Hastell)ص:۱۳۔

(۱۴)ماڈرن بلیف،ص:۲۰۵۔

(۱۵)یہ علامات بے ساختہ قرآنی اصطلاح آیات کا کہنا چاہئے لفظی ترجمہ ہے۔

(۱۶)(Science and Unseen World)سائنس اور نادیدہ دنیا،ص:۲۰۔

(۱۷)(Science and Unseen World)سائنس اور نادیدہ دنیا،ص:۲۳۔

(۱۸)یہ حضرات صوفیہ کی اصطلاح ظلی وجود کے لفظی ترجمہ کے سوا کیا ہے۔

(۱۹)(Will to Doubt)ص:۱۸۱۔

(۲۰)(A Short Histor of Science by Sir W.C.Dampiers)،ص:۱۷۱

(۲۱)سائنس کے ناحل مسائل(Unsolved Problems of Science)ص:۳۰

(۲۲)کتاب بالا کا گرد پوش،ص:۱۷۴-۱۷۵۔

(۲۳)کتاب بالا کا گرد پوش،ص:۱۹۰

(۲۴)(The Unseen world by Arthur Eddington)

(۲۵)جبر واختیار کے مسئلہ کے کیسے فطری حل کی طرف سائنس نے پہونچا دیا کہ جبریت پر چاہے جتنے دلائل پر دلائل پیش کئے جائیں لیکن خود قائل جبریت بھی زندگی کے قدم قدم پر فطرتاً کیا اضطراراً اپنے کو مختار ہی محسوس کرتا ہے اور اسی لیے دین ہی نے اس کو مکلّف نہیں قرار دیا بلکہ دنیا میں بھی اس کو اپنے نیک وبد اعمال وافعال کا خود ذمہ دار فاعل جاننا، انفرادی اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں ناگزیر ہوتا ہے۔

(۲۶)۔Science and the Modern Mind۔

(۲۷)ماڈرن بلیف حصہ نہم،ص:۲۵۰۔

(۲۸)اصل میں ادراک وفکر یا شعور سب کے مقابلہ میں فلسفہ وسائنس سب کی چولوں کو اپنی اپنی جگہ ٹھیک بٹھا دینے والی اصطلاح علم کی ہے، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔

(۲۹)غلط صحیح خدا جانے کہیں پڑھا یا سنا کہ عالمگیر علیہ الرحمہ نے اپنے والد کو جب قید کیا تو یہ بھی قید لگادی کہ اپنے کھانے کے لیے صرف کوئی اناج تجویز کرلیں، شاہجہاں نے اپنے شاہجہانی باورچی سے مشورہ کیا، اس نے عرض کیا کہ حضور بس چنے منظور کرلیں، پھر انشاء اللہ زندگی بھر دووقت بھی آپ کے دسترخوان اسی کے الوان نعمت سے بھرا رکھوں گا، گویا یہ چنا پرانے سائنس دانوں کا نام نہاد ''مادہ'' تھا۔

(۳۰)یہ کائنات کی وسعت کے بارے میں آئن اسٹائن کا نظریہ ہے، مگر یہ صرف ایک ''ریاضی داں کا قیاس'' ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان ابھی تک کائنات کی وسعت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔

تفسیر سورۃ العصر المسمی بہ

نظام صلاح واصلاح۔ تنقیدی جائزہ

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی (۱)

عثمانیہ یونیورسٹی کی تاسیسی اور تدریسی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی (۱۹۷۶ء۔۱۸۸۹ء) کے اسماء گرامی کا ذکر ضرور آئے گا۔ شروانی صاحب اس کے بانی شیخ الجامعہ تھے۔ مولانا فراہی نے اس کے نصاب کی ترتیب میں اساسی کردار ادا کیا۔ مولانا گیلانی نے اس کے شعبہ دینیات کو ترقی کے زینوں پر لا کھڑا کیا اور مولانا عبدالباری ندوی نے ایک فلسفی کی حیثیت سے اس کے شعبہ فلسفہ کو اسلامیات کا رنگ دینے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ آپ کی اسی فلسفیانہ قدرومنزلت کو دیکھتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی نے آپ کے متعلق فرمایا تھا کہ: ''آپ کے ہاتھوں پر فلسفہ اسلام لایا ہے''۔[1] مولانا عبدالباری ندوی کے متعلق بغیر کسی خوف کے کہا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کے بعد اگر کسی نے اسلام کے فلسفیانہ پہلوؤں کو ابھارا ہے تو وہ آپ ہی کی شخصیت ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ آپ کو علامہ سے علمی تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ مولانا کی تصانیف کی تعداد بارہ ہیں۔ ان تصانیف کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ منطق اور فلسفہ میں یکتائے روزگار تھے۔ لیکن افسوس کی تھانہ بھون سے وابستگی کے بعد آپ کا یہ فلسفیانہ قلم محو خواب ہوگیا۔ اسی پہلو کی طرف مولانا علی

---

(۱) شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

میاں ندویؒ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اس آخری دور میں ان کے قلم سے ایک اور مفید تصنیف ''مذہب اور سائنس'' نکلی جو ہماری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ نے شائع کیا۔ اس پر مشہور فاضل ریاضیات ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔ جس میں انھوں نے اس کتاب کو سراہا ہے۔ اس کتاب میں ان کا قدیم شبلوی اسلوب پھر جاگ اٹھا ہے اور ان کے اشہب قلم کو اپنی بھولی ہوئی راہیں یاد آگئی ہیں۔ یہ کتاب ان کے عالم ہوش اور صلاحیت فکر وتحریر کی آخری یادگار ہے'' ۔[۲]

مولانا کی اس علمی اور فلسفیانہ منزلت کو دیکھتے ہوئے ان سے درخواست کی گئی کہ سیرۃ النبی میں معجزات کی بحث کی ترتیب وتسوید کے لیے اپنے قلم کو اٹھائیں۔ سید سلیمان ندوی نے مقدمہ میں اس کا اس طرح ذکر کیا ہے:

> ہماری جماعت میں بلکہ علماء کی جماعت میں پروفیسر عبدالباری ندوی (معلم فلسفہ جدیدہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، دکن) سے بڑھ کر فلسفہ جدیدہ کا کوئی ماہر نہیں، معجزات کی بحث میں ضرورت تھی کہ اس باب میں فلسفہ جدیدہ کی جو موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں ہیں ان سے بھی تعرض کیا جائے۔ چنانچہ میری درخواست پر موصوف نے ''معجزات اور فلسفہ جدیدہ'' کا باب لکھ کر عنایت کیا ہے جو اس کتاب کے صفحہ ۸۳ سے شروع ہو کر صفحہ ۱۴۹ پر تمام ہوا ہے۔[۳]

مولانا کی ایک تصنیف ''تفسیر سورۃ العصر المسمی بہ نظام صلاح واصلاح'' کے عنوان سے ہے جس میں آپ کا دینی، اصلاحی اور ملی جذبہ پوری طرح کارفرما نظر آتا ہے اسے ایک منظّم ومرتب تصنیف نہیں کہا جاسکتا ہے، ملت اسلامیہ ہند کے انتشار، انحطاط اور دینی سقوط پر مولانا نے اپنے قلق اور حزن والم کو پیش کیا ہے۔ اس کی سطر سطر مولانا کے کرب ودرد پر گواہ ہے۔ آپ کی اولین خواہش تھی کہ ملت اپنے دین سے جڑی ہوئی ہو، اس کے تقاضوں اور مطالبات کی پابند ہو، شریعت اسلامیہ سے اس کا انحراف، سیرت پاک سے اس کا ابتعاد اور دینی مطالبات سے اس کی لاپرواہی ان کے لیے باعث عذاب

۔تھی۔نئی نسل کی غیر اسلامی حرکات اور غیر دینی ترجیحات کی وجہ سے مولانا کو عجیب سوزش تھی اور والدین کی اپنے بچوں سے غفلت کے سبب مولانا اضطراب کے حصار میں رہے یہی اضطراب اور یہی الجھنیں اس کتاب میں بغیر کسی تنظیم وتنسیق کے بکھری ہوئی ہیں۔

اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ مولانا نے انفرادیت کو اجتماعیت پر ترجیح دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بار بار مختلف حوالوں سے انفرادی اصلاح پر اس کتاب میں زور دیا گیا ہے۔ان کے نزدیک تنظیم سازی، جلسے، تقاریر، تصانیف، مدارس اور جامعات کی بہت زیادہ کوئی اہمیت نہیں۔ مولانا نے کالجز اور جامعات کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا:۔

> اس طرح کچھ بطنی سعادت مند اسکولوں اور کالجوں کے سراپا دین دشمن ماحول سے بھی دین وایمان سلامت لے کر نکل آتے ہیں، ورنہ سچ پوچھیے تو یہ غارت گر دین وایمان تعلیم گاہیں سیدھا جہنم کا ٹکٹ ہوتی ہیں۔[۴]

مولانا نے جامعات کی پرزور انداز میں مذمت کی ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک جدید علوم، فلسفہ، سائنس اور انگریزی سے ایمان ویقین پر ضرب پڑتی ہے۔مولانا اس میں جا بجا مغربیت سے برسر پیکار ہیں، انھیں مغرب کا داغ دار، سیاہ اور بھیانک چہرہ ہرگز گوارا نہیں۔ یہ ایمان کے لیے سم قاتل ہے۔انھیں فرنگیوں میں کوئی حسن اور خوبی نظر نہیں آتی۔ان کا ہر کام، ہر سوچ اور ہر آواز شر ور وفتن پر مبنی ہے۔اہل مغرب خیر وصلاح کے دشمن ہیں اسی عداوت میں مولانا سائنس کے مخالف ہو گئے۔اپنی مغرب بے زاری کا مولانا نے اس طرح اعلان کیا ہے:۔

> عجیب بات ہے کہ جدید فرنگی راہوں کی ایک اجتماعیت ہی پر کیا موقوف اس کی سیاسیات ومعاشیات، تمدن وتہذیب کون سی ایسی چیز ہے جس میں انسانی زندگی کے لیے خیر وصلاح سے زیادہ شر وفساد کا سامان نہ ہو اور تو اور سب سے زیادہ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ان کی سائنس اور سائنسی ایجادات ہیں۔[۵]

مولانا نے جدید تعلیم گاہوں کو منکرات کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اور امت مسلمہ سے درخواست کی ہے کہ وہ انھیں بند کرنے کی کوشش کریں اور اپنے نونہالوں کو ان سے دور رکھیں کیوں کہ ان کے جراثیم ان کے دین ایمان کو برباد کرڈالیں گے، یہی وجہ ہے کہ مولانا جدید علوم کو اپنے بچوں کے لیے ضروری تصور نہیں کرتے، اگر سائنس کی حد تک احساس ضرورت قدرے ہو تو اس کا انتظام بالکلیہ دینی علوم و تعلیم کے اس طرح زیر نگرانی وزبردست ہو کہ ایمان وعمل صالح پر کے زہریلے اثرات کا قطعاً کوئی احتمال واندیشہ نہ رہے۔[۶]

مولانا کا سائنس کے متعلق یہ خیال قرآن کریم کی رو سے مناسب نہیں ہے۔ قرآن کریم اور اسلام کے تعلق سے جدید اور قدیم علوم کی تقسیم یا تفریق کا تصور نا قابل قبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک قصہ قدیم وجدید دلیل کم نظری پر دال ہے۔ اسلام علوم نافع وغیر نافع کی بات کرتا ہے۔ تصریف آیات قرآن کریم کا ایک معروف اسلوب ہے۔ وہ اپنی بات کو مختلف انداز، مختلف الفاظ، مختلف آیات، مختلف سورتوں، مختلف قصوں، مختلف دلائل اور مختلف سائنسی شواہد کے ذریعہ ذہن نشین کرانے کا خواہاں ہے۔ اس تعلق سے آفاق وانفس کو موضوع بناتے ہوئے انھیں توحید سے باندھنے کا متقاضی ہے۔ اس ذہن سازی کے لیے قرآن کریم مختلف سوالات کے ساتھ عباداللہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے۔ مثلاً صاحبِ اختلاف لیل ونہار، مردہ سرزمین کو سبزہ زار بنانے والا، زمین کے اندر سے پانی دینے والا، ستاروں کی جگمگاہٹ اور ہواؤں کو ہنکانے والا کون ہے؟ اس طرح کے بے شمار سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں اور ان تمام سوالات کے ماوراء سائنس ایستادہ ہے۔ اسی سائنس کو سورۃ الرحمٰن میں ''سلطان'' کہا گیا ہے۔ آج کے جدید دور میں شارحین اسلام کے لے سائنس ایک بڑا ہتھیار ہے اگر اس سے بے توجہی برتی گئی تو گویا ہم عصر حاضر کے ایک اہم مطالبہ سے بے پرواہیں۔ کیا اس تناظر میں مولانا کے یہ خیالات لائق توجہ ہیں؟

مولانا نے ایک طرف جہاں جامعات کو غارت گر ایمان قرار دیا ہے اور ان کے بالمقابل مدارس کو فوقیت دی ہے، اس کے باوجود مدارس کے اساتذہ کرام اور فضلاء کو ہدف

تنقید بھی بنایا ہے کیوں کہ یہ طائفہ مولانا کی رائے میں اخلاص، انابت وانقیاد اور اتقاء سے خالی ہے۔ انھیں حاملین اسناد تو کہا جاسکتا ہے، حاملین اخلاص ہرگز نہیں۔ مولانا کے تاثرات ملاحظہ ہوں:۔

حضرات انبیاء مدرسے قائم کرنے تشریف لائے تھے۔ نہ کتب خانے کھولنے، نہ کتابیں لکھنے، نہ رسالے نکالنے، نہ انجمنیں اور جماعتیں بنانے، نہ جلسے اور تقریریں کرنے، بلاشبہ ان چیزوں سے وسائل کا ___ بہ نظر وسائل و بقدر وسائل ___ کام لینا وقتی مصالح وحالات کے لحاظ سے ضروری ہے لیکن مرجع ومنتہا تو ہر وسیلہ یا راستہ کے ہر ہر قدم کا بالذات منزل مقصود ہی رہنا چاہیے، اس منزل ومقصد ہی کے اوجھل ہوجانے کا نتیجہ ہو رہا ہے کہ مثلاً مدرسوں پر مدرسے قائم ہوتے چلے جارہے ہیں، سینکڑوں ہزاروں کی تعداد ان سے فراغت کی سندیں لے لے کر نکلتی رہتی ہیں، بایں ہمہ خال خال ہی ان میں کسی کو اس کا شعور واحساس ہوتا ہوگا کہ یہ علم انھوں نے خود عمل کرنے اور دوسروں کو علم وعمل کے اسی خیر کی طرف بلانے یا معروف ومنکر کے امرونہی کے لیے حاصل کیا ہے، بڑا سبب اس کا وہی عام مغالطہ ہے کہ جس علم کا اصل مقصود خود عمل اور دوسروں کو دعوتِ عمل تھا وہ بطور "علم برائے علم" خود ہی مقصود ومعبود بن کر رہ گیا ہے، علم بھی اس طرح کا کہ کتابوں کا ایک مقررہ نصاب پورا کرا کے ___ خواہ کتابی استعداد بھی پوری نہ ہو ___ جو بھی الٹا سیدھا امتحان پاس کرلے اس کو عالم دین ہونے کی سند تھمادی جاتی ہے۔ ؎

مولانا کی سوچ پر ایک خاص نقطہ نظر حاوی ہے۔ یہی ان کے نزدیک سنگ میل، حقیقی موقف اور بنیادی پڑاؤ ہے جو ہر مرض کا علاج ہے۔ اگر وہ ڈگر مطمح نظر ہو اور اسی پر اپنی زندگی ڈال دی جائے تو تمام امراض سے نجات مل سکتی ہے اور ایک ایسی حکمت ہاتھ آسکتی ہے جو زندگی کو کندن بنادے اور اسے دینی فہم سے آراستہ کردے نیز اللہ اور اس کے رسول کے احکام کا پابند بنا سکتی ہے۔ اسی حکمت، سنگ میل اور موقف کا نام تھانہ بھون

ہے۔ یہی سوچ زندگی کو تابندہ و روشن بنادے۔ اِس جہانِ تابندہ اور منارہ نور کا نام مولانا اشرف علی تھانویؒ ہے جنھیں حکیم الامت کے لقب سے سرفراز کیا گیا ہے۔ بڑے بڑے دانش وروں نے ان کی مدح سرائی کی ہے۔ انہی دانش وروں میں سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی کے نام نامی بھی شامل ہیں۔ مولانا عبدالباری نے حکیم الامت کی حکمتوں کو یوں قلم بند کیا ہے:۔

مطلب ہرگز نہیں کہ اندھے کی لاٹھی چلانے لگے۔الحمدللہ کہ علمائے امت، حضرات فقہاء رحمہم اللہ نے دین کے دوسرے اوامر ونواہی کی طرح خود امر ونہی کے احکام کلیات وجزئیاتِ اصول وفروع، کتاب وسنت ہی کی روشنی میں مرتب فرمادیئے ہیں انہی کو ہر بُرے بھلے ماحول کے چوکھٹے میں بے تکلف فٹ کیا اور وقت وموقع مناسب کام لیا جاسکتا ہے۔بس کلی اصول اس باب میں وقت کے حکیم ومجدد حضرت حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمہ کا سامنے رکھنا چاہیے کہ جسمی بیماریوں کی طرح دینی واخلاقی بیماریاں بھی ہیں اور جس طرح ہم کو جسم کی بیماروں کے ساتھ تو ہمدردی وشفقت لیکن بیماریوں سے تکلیف ونفرت ہوتی ہے اور حسب تعلق وطاقت ہم ان کو دور کرنے کی دوادوش میں کوئی کسر لگی نہیں رکھتے۔نہ بیمار کو اس کے حال پر چھوڑ دینا گوارا کرتے ہیں۔ بعینہ یہی معاملہ معاصی ومنکرات کے بیماریوں کے ساتھ نقلاً ہی نہیں عقلاً بھی کرنا چاہیے کہ جیسا اور جتنا ان سے تعلق ہو اور جتنی ان کے فلاح وپرہیز کی ہم فکر وتدبیر کی طاقت رکھتے ہوں، اس میں کمی نہ ہو بلکہ جس طرح معمولی انسانیت کا تقاضا ہے کہ راستہ چلتے ہم کسی غیر سے غیر کو بھی کسی تکلیف ومرض میں پائیں تو جو کچھ برمحل اس کی مدد کرسکتے ہوں کریں۔ یہی تو مطلب ومطالبہ رحمت عالم ﷺ کی طرف سے معروف ومنکر کے امر ونہی کو راستہ تک کے حقوق میں داخل فرمادینے کا ہے کتنی بڑی رحمت وشفقت ہے۔[۸]

حکیم الامت کی تصانیف، اقوال، ملفوظات اور مجالس کے سامنے دنیا کی ہر شی مولانا کے نزدیک بے معنی ہے۔ اخبارات، جدید وقدیم درس گاہیں، علوم وفنون اور

جُماعتیں سب کی سب مقاصد سے بے بہرہ ہیں۔ مولانا نے مرحوم مولانا ابرارالحق کے مدرسہ کو ''اشرف المدارس'' قرار دیا ہے کیوں کہ اس کی بنیادوں میں مولانا اشرف علی تھانوی کا فکر شامل ہے۔ مولانا ابرارالحق صاحب نے طریقت وتصوف کی ایک خوبصورت دنیا بسائی ہے۔ جہاں ''احسان'' کے مظاہر پورے شباب پر ہیں۔ مولانا کی رحلت سے تصوف کا ایک بلند وبالا مینار ڈھ گیا۔ انہی تمام امتیازات کی وجہ سے مولانا نے اسے اشرف المدارس قرار دیا ہے۔ اس پوری کتاب کا ماحصل یہ ہے کہ مرشد اور شیخ کی تربیت کو اصل حیثیت دی گئی ہے۔ جن لوگوں نے ذہنی اور دینی تربیت کے لیے کتابوں اور مراجع ومصادر کا سہارا لیا ہے وہ مولانا کے نزدیک لائق ستائش نہیں ہیں۔

مولانا نے جماعتی اور تنظیمی کوششوں کو بنظر استحسان نہیں دیکھا ہے۔ جیسا کہ پیچھے اس کا ذکر آچکا ہے۔ اسی تناظر میں مولانا کے نزدیک اخوان المسلمون بھی لائق قدر نہیں ہیں۔ اور حکومت الٰہیہ کے قیام کے باب میں اخوان کی قربانیاں، شہادتیں اور محاذ آرائیاں لاطائل نظر آتی ہیں۔ انھیں قدم قدم پر ناکامیوں کا سامنا اس لیے کرنا پڑا کہ مولانا کے نزدیک یہ اخوانی جماعت ایمان اور عمل صالح سے خالی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

> سوال صرف اس ملک ومعاشرے کی (نہ صرف جماعت دعوت کی) بہ حیثیت مجموعی ایمان وعمل صالح والی صلاحیت وصلاح کا ہے کیوں کہ زمین پر خدائی حکومت چلاسکنے کی صلاحیت واہلیت والوں ہی سے استخلاف فی الارض یا حاکمانہ اقتدار کا وعدہ ہے۔[9]

قرآن کریم کی آیت کریمہ ''أن الارض یرثھا عبادی الصالحون[10]'' پر غور کیا جائے تو مولانا کے مذکورہ بالا خیال سے اتفاق ممکن نہ ہوگا۔ یہ سنت اللہ رہی ہے کہ جب تک کسی قوم میں اقتدار سنبھالنے کی صلاحیت ہوتی ہے دنیا کی دیگر قوموں کے مقابلے میں علوم وفنون، سائنس وٹکنالوجی اور دنیا کی بے شمار کارگزاریوں میں ممتاز ومنفرد ہوتی ہے وہی دنیا کا اقتدار سنبھالتی ہے۔ قوموں کی پیشوائی کرتی ہے اور اپنے اثر ورسوخ کے مطابق

دنیا کو چلاتی ہے۔ یوں جانیے کہ جو قومیں دنیا کو دیتی ہیں اور کارپوریٹ لائف کو سہولیات سے ہم کنار کرتی ہیں اقتدار ان کا مقدر اور عنان گیری ان کا تشخص قرار پاتا ہے۔ آج امریکہ اپنے تمام تر ظلم وعناد اور انسانیت سوز مظالم کے باوجود دنیا کا حاکم اور پیشوا ہے صرف اس لیے کہ وہ دنیا کو دیتا ہے۔ امت مسلمہ جب تک دنیا کو دیتی رہی، عوام الناس کو اندھیروں سے نکالتی رہی اور ان کے لیے آرام وآسائش فراہم کرنے کے لیے فکر مند رہی تب تک دنیا پر اس کا سکہ چلتا رہا۔ اس قرآنی اصول کے مطابق مولانا کے خیال سے ہم آہنگی جتانا ہر صاحب فکر کے لیے مستبعد ہوگا۔ صرف عبادات، تسبیحات اور طریقت کے زور پر اقتدار سنبھالنا مشکل ہوگا۔

مولانا نے جمعیۃ العلماء کی کارکردگی پر بھی اطمینان کا اظہار نہیں کیا اور جماعت اسلامی کی خدمات کو ''الٹی منطق'' کا نام دیا۔ مولانا کی اس تعبیر سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ جماعت اسلامی کے تئیں ان کے کیا جذبات تھے؟ مولانا نے اس کے متعلق اظہار خیال فرماتے ہوئے تحریر کیا کہ ان کی تمام جدوجہد حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے ہیں جب کہ ان کی یہ ریاضتیں انبیائی منہاج کے برعکس ہیں مولانا نے اپنے خیال کو اس طرح پیش کیا ہے:۔

> دوسری نسبتاً نو پیدا جماعت اسلامی ہے، یہ بھی اصلاً سیاسی میدان ہی کی پیداوار ہے جو حکومت وسیاست کے غیر اسلامی نظامات ونظریات کے مقابل الٰہی حکومت یا اسلامی سیاست کی برتری کی دعوت ودعوٰی لے کر اٹھی ہے۔ نقطہ نظر یہ تھا اور بڑی حد تک اب بھی ہے کہ مسلمانوں کی ہر قسم کی صلاح واصلاح کے لیے مقدم سیاسی انقلاب ہے۔ بلا اسلامی حکومت کے نہ مسلمان مسلمان بن سکتے ہیں نہ ان کے دینی ودنیوی مسائل ومشکلات حل ہوسکتے ہیں۔ یہ درحقیقت انبیائی تعلیم وتاریخ کی پوری منطق کو الٹ کر نتائج کو مقدمات اور مقدمات کو نتائج بنادینا تھا۔ حضرات انبیاء اور انبیائی راہ پر چلنے والوں کا سب سے پہلا کام دعوتی جدوجہد سے ایمان وعمل صالح کی زندگی یا معاشرہ پیدا کرنا ہے۔ باقی دینی یا الٰہی حکومت کا قیام وبقا خود خدا کی طرف اور اس کی نصرت خاص سے موعود ومشروط نتیجہ یا انعام ہے۔ پہلے ایمان وعمل صالح

والا معاشرہ پیدا کر لینے کا۔ ''وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصلحت ليستخلفنهم في الأرض[۱۱]'' یعنی جو لوگ (کسی معتد بہ جماعت یا معاشرہ کی صورت میں) ایمان وعمل صالح کی زندگی کا ثبوت دیتے یا اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ ان کو زمین کی خلافت (اسلامی یا الٰہی حکومت) بھی ضرور اللہ تعالیٰ عطا کر کے رہے گا۔[۱۲]

مولانا نے جمعیۃ العلماء، اخوان المسلمون اور جماعت اسلامی کا نا کام جماعتوں کی حیثیت سے ذکر کیا ہے۔ البتہ جماعت تبلیغی اور اس کے بانی حضرت مولانا الیاسؒ کی ستائش کی ہے اور اس کے ثمرات اور خصائص کے ذکر میں وسعت قلبی کا ثبوت دیا ہے۔ صرف یہی ایک جماعت مولانا کی نظر میں ٹکتی ہے اور اس کی دینی سرگرمیوں سے مطمئن ہیں۔ کیوں کہ ایمان اور اعمال صالحہ انسان کو خود کرسیٔ اقتدار پر بٹھا دیتا ہے۔ مولانا اسی نظریہ کے حامل ہیں آپ کا یہ بھی خیال ہے کہ مکی زندگی دراصل تربیت اور تیاری کی زندگی ہے۔ یہی اصلاحات وامتحانات مدنی زندگی کا اہل قرار دیتے ہیں اور اسلامی ریاست کے قیام کے باب میں معاون ومساعد ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا ابرار الحق کی دینی مساعی کو ''دعوۃ الحق'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ دونوں جماعتوں کی خدمات کو نمونہ اخلاص قرار دیا ہے اور اسے انبیائی خدمات کے تناظر میں دیکھا ہے اور یہ دونوں سیاست وحکومت سے یک قلم قطع نظر کر کے دعوت وتبلیغ کے خاص وخالص انبیائی ورثہ کے کام کو مخلصانہ طور پر خالص دینی نقطہ نظر سے انجام دے رہی ہیں۔ [۱۳]

اس کتاب کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ پوری کتاب میں جابجا آیات کریمہ نقل کی گئی ہیں۔ یہ بات بڑے اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مولانا کو قرآنی تفکر وتدبر سے انتہائی شغف تھا۔ انھوں نے استدلال اور استشہاد کے لیے آیات کریمہ کا استعمال کیا ہے۔ خاص طور سے نظام صلاح واصلاح سے متعلق آیات کریمہ مولانا کے استحضار میں تھیں۔ اسی استحضار کا نتیجہ ہے کہ مولانا نے قرآن کریم کو صرف کتاب ہدایت نہیں بلکہ نظام ہدایت

بھی بتایا ہے اور یہ بھی فکر قرآنی ہی کی دین ہے کہ اسلام نہ تو دنیا پرستی اور نہ ہی دنیا بیزاری کا نام ہے۔ مولانا کی نظر میں جامعات کے اساتذہ کرام کی طرح دارالعلوموں کی بے جان مشینوں کے ڈھالے ہوئے علماء بھی دنیا ہی کے کسب وحصول کی راہیں تلاش کرنے میں لگ جاتے اور یوں انبیائی ڈگر سے بہک جاتے ہیں۔

اس کتاب کا ایک بنیادی وصف یہ ہے کہ امت مسلمہ کی حیثیت کے تعین پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کی اساسی خدمت پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اسے خیر امت اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ وہ اقوام عالم کو اندھیروں سے نکال کر اجالوں میں لائے گی اسی کو قرآن کریم میں شہادت علی الناس بھی کہا گیا ہے۔ معروف کا حکم دینا اور منکر سے عباداللہ کو باخبر کرنا اس کا فریضہ ہے۔ اگر اپنی ذمہ داریوں اور لوگوں کے تئیں خیر خواہی سے غافل ہے تو اسے نہ تو خیر امت اور نہ ہی امت وسط کہا جائے گا۔ مولانا نے "النصح لکل مسلم[۱۴]" کی نہایت اچھی تشریح کی ہے۔ یہ ایک جامع حدیث ہے اس کی تفسیر میں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ ایک مسلم کا فریضہ یہ ہے کہ اپنے بھائی کی ہر خوشی میں شامل رہے، اس کی ہر مصیبت میں دامے درمے سخنے کھڑا رہے، اس کی مسکراہٹوں میں مسکرائے، اس کی کراہ سے بے چین ہو جائے، اس کی کسمپرسی میں سہارا بن جائے۔ اس کی آزمائشوں میں دادرسی کے لیے تیار رہے، اس کی فاقہ زدگی اسے تڑپا دے اور اس کی خوش حالی اسے مسرتوں سے ہم کنار کر دے۔ قرآن کریم میں اسی مفہوم کو اس طرح پیش کیا گیا ہے: "مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ"۔[۱۵] محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں، آپس میں رحم دل ہیں۔

اس آیت سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ جس طرح دنیاوی معاملات میں ایک صاحب اسلام اپنے بھائی کے لیے ہمہ آن کھڑا رہنا اور اس کی ہر آواز پر لبیک کہنا اس کا اخلاقی فریضہ ہے۔ اسی طرح دینی معاملات میں بھی وہ اپنے بھائی کی معاونت کے لیے ہر طرح تیار رہے۔ اگر وہ فواحش میں مبتلا ہے تو وہ اسے اس سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش

کرے۔ اگر وہ نماز سے بے پرواہ ہے تو وہ اسے مسجد میں لے جانے کے لیے بے چین ہو۔ ایک مسلم اپنے غیر دیندار بھائی کو اسلامی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرے۔ اس حدیث میں انتہائی وسعت ہے۔ ایک صاحب ایمان اپنے خاندان، اپنے اعزاء اپنے رفقاء، شریک کار، اہل قریہ، ارباب شہر، اپنے ملک اور دیگر ممالک میں بسنے والے مسلم بھائیوں کے دینی اور دنیاوی امور میں معاون و مددگار رہوگا۔ مولانا نے ''النصح لکل مسلم'' کی کیا خوب تصویر کشی کی ہے:۔

> معروف و منکر کے امر و نہی کے علاوہ اور بھی ہر طرح نفس مسلمان ہونے کی ہی حیثیت سے ہر مسلمان کی خیر خواہی (النصح لکلم مسلم) کا حق و فرض ہر مسلمان پر بلا کسی دوسرے رشتہ و تعلق کے عائد ہے حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز و زکوۃ کے ساتھ ہی ''النصح لکل مسلم'' کی بھی بیعت لیا کرتے تھے۔ واضح رہے کہ ایمانی دوستی یا ولایت کا یہ فرض صرف وعظ و تقریر یا خطاب عام سے ادا نہیں ہوتا بلکہ مراد یہاں خصوصیت سے انفرادی امر و نہی ہے ''بعضہم اولیاء بعض'' کی نفس ایمانی ولایت و اسلامی رشتہ ہی کی بنا پر ہر فرد مسلمان پر دوسرے مسلمان کی خیر خواہی و ہمدردی کا فرض عائد ہو جاتا ہے اور اس سے بڑھ کر کسی کی ہمدردی یا دوستی کیا ہوگی کہ اس کو بھلائی برائی نیکی بدی کی ہر چھوٹی بڑی بات حسب موقع صرف بتلا ہی نہ دی جائے بلکہ امر و نہی کی تعبیری معنویت یہ ہے کہ اپنی والی پوری کوشش نیکی کی راہ پر لگانے اور بدی کی راہ سے ہٹانے کی کی جائے۔[۱۶]

مذکورہ بالا سطور میں اس کتاب کا مختصر ترین تعارف پیش کرنے اور اس کے بنیادی نکات کو منظر عام پر لانے کی یہ ایک ادنیٰ سی کاوش ہے۔ لیکن یہ وضاحت ایک بار پھر ضروری ہے کہ یہ ایک غیر مرتب کتاب ہے۔ اسے سورہ والعصر کی تفسیر و توضیح کہنا بھی مشکل ہوگا۔ ایمان اور عمل صالح کی جہتوں کی تفصیل میں جانے کی یہ ایک ادھوری کوشش ہے۔ مولانا نے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی بھی تشریح میں جانے کی نامکمل کاوش کی ہے۔ تواصی بالحق کا

ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں انسان کا عزم وحوصلہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ ثبات قدمی سے رفاقت کمزور پڑنے لگتی ہے اور وہ خوف ودہشت کا شکار ہوجاتا ہے۔ لیکن جس کے پاس ایمان کی دولت ہو دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کے عزم صمیم کو چیلنج نہیں کرسکتی۔ وہ اسلام کے سخت دنوں میں ہر محاذ پر جانے کے لیے مستعد رہتا ہے۔ جہاد اس کی زندگی کا حصہ، دشمنان انسانیت کا خاتمہ اس کا ہدف اولیں ہے، جہاد کے راستوں میں اگر مشکلات آتی ہیں تو وہ صبر وثبات کا پہاڑ بن جاتا ہے۔ پوری کتاب میں اس کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ہے سورۃ العصر کے موضوع پر مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر افادیت کی حامل ہے۔ اس کی نظیر متقدمین کے یہاں بھی مفقود ہے۔ کاش مولانا اپنی اس کتاب کی تصنیف سے قبل مولانا فراہی کی اس تفسیر کا مطالعہ کرلیتے تو اس کتاب کا رنگ ڈھنگ ہی الگ ہوتا مولانا کی یہ غیر مرتب کتاب دراصل حکیم الامت کے خیالات پر مبنی ہے۔ جگہ جگہ ان کی کتابوں کے اقتباسات اور ان کے خیالات کی توضیح وتشریح ہے حکیم الامت کے فرمودات مولانا کے نزدیک تمام دینی ودنیاوی مسائل کا حل ہیں۔ اس کے علاوہ مصلحین، مختلف جماعتوں، دارالعلوموں، علماء کرام اور فضلاء مدارس کی خدمات مولانا کے نزدیک غیر تسلی بخش ہیں۔ حکیم الامت کے علاوہ اگر کوئی مولانا کی نظر میں قدرے قابل اعتنا ہے تو وہ اشرف المدارس کے بانی مولانا ابرار الحق صاحب اور ان کی جماعت دعوۃ الحق کی کارگزاریاں۔ اس کتاب کی ترتیب میں ''احیاء العلوم'' سے بھی مدد لی گئی ہے۔ کہیں کہیں مولانا مناظر احسن گیلانی کا بھی ذکر آگیا ہے۔ اخبار ''صدق جدید'' کا بھی بارہا حوالہ آیا ہے۔ مولانا محمد منظور نعمانی کی نگارشات اور اصلاحی تحریریں بھی مولانا کے نزدیک قدر ومنزلت کی حامل تھیں۔

مولانا کا تمام تر ارتکاز انفرادی اصلاح پر رہا ہے۔ اس کی وجہ سے تنظیمیں مولانا کو بے مقصد نظر آتی ہیں۔ اجتماعی اصلاحی جدوجہد مولانا کے نقطہ نظر میں بہت زیادہ قابل قبول نہیں، جمعیۃ العلماء، جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون کی باب میں مولانا کے یہاں ستائشی کلمات نہیں ملتے کیوں کہ حصول اقتدار ہی ان کی غایت حقیقی ہے جب کہ مولانا کا

خیال ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ سے اقتدار خود چل کر آتا ہے۔ مکی اور مدنی زندگی کا یہی پیغام ہے۔ پاکستان کی ناکامیوں اور کج فہمیوں کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ انگریزوں کے خلاف نہایت سخت لہجہ اختیار کیا گیا ہے، ان کا ہر انداز، ہر زاویۂ فکر اور ہر علمی دریافت فتنہ وفساد کا شاخسانہ ہے۔ ۱۷ آپ کی اسی حدت وشدت کو دیکھتے ہوئے ہر معروضی فکر کا یک رخا اظہار خیال تصور کرے گا، مولانا کی شدت پر مولانا علی میاں ندوی نے یوں قلم اٹھایا ہے۔ ''مولانا عبدالباری صاحب میں ایک حد تک شدت اور بے لچک پن تھا وہ اپنے خلاف مزاج اور خلاف اصول کسی چیز کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے چھوٹے اکثر ان سے خائف اور ان سے دور رہتے تھے اور گھر کے کم افراد ان کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ ان کی اسی مزاجی خصوصیت کو مولانا مدنی نے ایک مرتبہ اس بلیغ جملہ میں ادا کیا کہ: مولانا عبدالباری چاہتے ہیں کہ شیطان مرجائے اور ایسا ممکن نہیں ہے۔ ۱۸ جب کہ قرآن کریم میں اہل کتاب اور امت مسلمہ کے درمیان اتحاد واتفاق کی ایک مضبوط شق موجود ہے۔ جسے سرسید نے تبیین الکلام ۱۹ میں نہایت وقیع انداز میں موضوع بحث بنایا ہے۔

انگریزوں کی اسی دشمنی میں مولانا نے جدید علوم وفنون، جامعات، جدید تعلیمی مراکز کو سرچشمۂ منکرات قرار دیا ہے۔ یہ جہنم کا ٹکٹ بانٹتی ہیں، مولانا کا یہ بھی فرمانا ہے کہ اخبارات، تصانیف اور انشاء پردازی درحقیقت انفرادی تربیت کے بالمقابل بے وقعت ہیں۔ جب کہ قرآن کریم نے اجتماعی دعوت واصلاح پر خاصا زور دیا ہے۔ ایک آیت کریمہ تو خود مولانا نے نقل کی ہے۔ ''والمومنون والمؤمنات بعضهم اولياء بعض يامرون بالمعروف وينهون عن المنكر'' ۲۰ (اور مومن مرد ومومن عورتیں باہمی دوست ہیں بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں) اس طرح کی بے شمار آیات کریمہ مل جائیں گی جن سے تنظیمی اور اجتماعی دعوت پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ارشاد ربانی ہے: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۲۱ سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں پس تم اپنے دو بھائیوں میں ملاپ کرادیا کرو۔

مذکورہ پہلوؤں کے علاوہ اس میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کا انفرادی اصلاح کے تعلق سے موثر کردار ہے۔ مولانا کے خیالات سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ ملت ہند کی بے راہ روی، صراط مستقیم سے ان کی دوری اور زر پرستی مولانا کے لیے پریشان کن تھیں۔ مولانا کے اضطرابات اس کتاب سے متبادر ہیں۔ پڑھتے ہوئے مولانا کی سوزش، تپش اور جلن محسوس کی جاسکتی ہے۔ مصلحین امت اور دردمندان ملت کا یہی حال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اس کی تصویر یوں پیش کی گئی ہے:

''لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ'' [۲۲]

(ان کے ایمان نہ لانے پر شاید آپ تو اپنی جان کھودیں گے۔)

حوالے

۱۔ پرانے چراغ، ابوالحسن علی ندوی، مکتبہ فردوس مکارم نگر، لکھنؤ، بار اول، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء، ۱۱۸/۲

۲۔ ایضاً، ص: ۱۲۶۔۱۲۷

۳۔ سیرۃ النبی، علامہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی ۲۰۰۳ء، ۱۵/۳۔۱۶

۴۔ تفسیر سورۃ العصر مسمی بہ نظام صلاح واصلاح، حضرت مولانا عبدالباری، ندوی، ادارہ مجلس علمی، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص: ۱۱۱۔۱۱۰

۵۔ ایضاً، ص: ۱۵۶

۶۔ ایضاً، ص: ۱۱۴

۷۔ ایضاً، ص: ۷۰۔۷۱

۸۔ ایضاً، ص: ۲۰۶۔۲۰۷

۹۔ ایضاً، ص: ۱۹۹

۱۰۔ الانبیاء: ۱۰۵/۲۱

۱۱۔ النور: ۵۵

۱۲۔ نظام صلاح واصلاح، ص: ۲۳۵۔۲۳۶

۱۳۔ ایضاً، ص: ۲۴۹

۱۴ احمد بن جنبل، ص:۳۶۶، ابن ماجہ میں ''والنصح لائمۃ المسلمین'' آیا ہوا ہے۔ دیکھیے، ابن ماجہ: مقدمہ ۱۸۰

۱۵ الفتح:۲۹/۴۸

۱۶ نظام صلاح واصلاح، ص:۸۲۔۸۳

۱۷ وضاحت کے لیے دیکھیے: ایضاً، ص:۱۵۶۔۱۵۷

۱۸ سرسید نے ''تبیین الکلام'' میں ایک باب بعنوان ''توریت، زبور اور انجیل پر مسلمانوں کا کیا اعتقاد ہے'' قائم کیا ہے۔ یہ باب اہل کتاب اور امت مسلمہ کے درمیان اعتقادی تعلق کو ثابت کرتا ہے۔ اگر دونوں اس پہلو سے اپنی اپنی کتابوں کا مطالعہ کریں تو ان کے مابین وقوعہ خلیج پاٹی جاسکتی ہے۔ سرسید ان کے مابین واقع انہی رجحانات اور باہمی مذہبی اعتقادات کو اٹھانا چاہتے تھے۔

۲۰ التوبہ:۷۱/۹

۲۱ الحجرات:۱۰/۴۹

۲۲ الشعراء:۳/۲۶

حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کا سلسلۂ تجدید اوراس کی خصوصیات

مفتی محمد زید ندوی مظاہری(۱)

حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ نے اپنے سلسلۂ تجدید میں جن موضوعات کا انتخاب کیا اور حضرت تھانویؒ کی جن تجدیدی اصلاحات کو جمع فرمایا ہے، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں وہ روحانیت اور تازگی آج بھی باقی ہے جیسا کہ پہلے پائی جاتی تھی، اور ٹھیک اسی طرح؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ آج بھی دین کے مختلف شعبوں میں انہی اصلاحات وتجدیدات کی ضرورت پائی جاتی ہے جیسا کہ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

> ضرورت ہے کہ ان اصلاحات وتجدیدات کو پھر سے موجودہ زمانہ کے مطابق جدید اسلوب میں اجاگر کیا جائے۔

یعنی ان تجدیدات کی بھی از سر نو تجدید کی جائے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ خود اپنی اصلاحات وتجدیدات کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

> طریق بالکل مردہ ہو چکا تھا، لوگ بے حد غلطیوں میں مبتلا تھے، بحمد اللہ اب سو برس تک تو تجدید کی ضرورت نہیں رہی، اگر غلط ہو جائے گا تو پھر کوئی اللہ کا بندہ پیدا ہو جائے گا، ہر صدی پر تجدید کو ضرورت ہوتی ہے، اس لیے کہ اس مدت کے بعد نری کتابیں ہی کتابیں رہ جاتی ہیں، اب تو خدا کا فضل ہے کہ وضوح ہو گیا اور کتابیں فی نفسہ تو کافی ہیں؛ مگر لوگ ان میں تحریفیں کر دیتے ہیں

---

(۱) استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء۔

(ا۔تجدید دین، ص:۵۱)

الحمدللہ یہ کام حضرت مولانا عبدالباریؒ نے انجام دیا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تجدیدی اصلاحات کو اس شان سے اور ایسے حسن سلیقہ سے جدید اسلوب میں مرتب فرمایا جس سے وہ اصلاحات وتجدیدات بڑی حد تک تحریفات سے محفوظ ہوگئیں اور آسان اسلوب میں پیش کرنے کی وجہ سے ہر طبقہ کے لیے اس سے استفادہ آسان ہوگیا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

> یہ بھی اللہ تعالی کی خاص رحمت وحکمت کا کرشمہ ہے کہ حضرت (اقدس تھانوی) کو اپنے آخری دور میں دو ایسے شارح وترجمان اور ان کے طریقۂ علاج اور ان کے ذوق ومزاج کے دو ایسے رمز شناس ملے جنہوں نے حضرت کے مضامین عالیہ اور نکات وتحقیقات کو اس دور کی نئی اور علمی وادبی پیرایہ بیان میں ادا کرنے کی خدمت انجام دی، اس کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے زیادہ قابل فہم اور قابل استفادہ بنا دیا، میری مراد مولانا عبدالباری ندویؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ سے ہے، اول الذکر نے تجدید تصوف وسلوک کی کتابیں لکھ کر اور ثانی الذکر نے اپنے مکاتیب اصلاح وتربیت اور چند نہایت باصلاحیت صاحب قلم اور مخلص مریدوں کو تیار کر کے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم (ناظم ندوۃ العلماء) تحریر فرماتے ہیں:۔

> مولانا عبدالباری ندویؒ نے ان دونوں لائنوں میں خصوصی علمی کام انجام دیا، وہ ایک طرف تصنیف وتالیف کے ذریعہ سے حضرت تھانویؒ کے رشد وہدایت کو وقت کے جدید اسلوب نگارش میں پیش کرتے رہے، اور دوسری طرف اپنے ملنے والوں اور تعلق رکھنے والوں کو دین کے صراط مستقیم کو اختیار کرنے کی تاکید کرتے رہے، اس طریقہ سے انہوں نے غیر معمولی کام انجام دیا۔
>
> (مقدمہ حیات عبدالباری، از محمود حسن حسنی ندوی، ص:۱۹)

اب ہم حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانویؒ کے چند تجدیدی اصلاحات کے نمونے پیش کرتے ہیں جن کو مولانا عبدالباری ندویؒ نے اپنی ان کتابوں میں جمع فرمایا ہے اور جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعۃً آج بھی ان شعبوں میں انہی اصلاحات وتنبیہات کی ضرورت ہے جس کی طرف مجدد الملت نے آج سے تقریباً سو سال قبل توجہ دلائی تھی، اب چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

دعوت وتبلیغ سے متعلق اصلاح وتجدید

حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ نے اپنے کتاب ''تجدید تعلیم وتبلیغ'' میں دعوت وتبلیغ سے متعلق تفصیلی بحث کی ہے، دعوت کے مختلف اقسام، دعوت حقیقیہ وحکمیہ، خطاب خاص وعام کی تفصیل، اپنوں اور غیروں کو دعوت دینے کے حدود وقیود اور اس کے شرائط بھی ذکر فرمائے ہیں، نیز عقائد واحکام اور فضائل ومسائل کی تبلیغ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، صرف چند باتیں بطور نمونہ اور خلاصہ کے ملاحظہ ہوں، مولانا عبدالباریؒ حضرت تھانویؒ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:۔

> خلاصہ یہ ہے کہ خطاب خاص (یا تبلیغ خاص) سارے مسلمانوں کو اپنے گھر (یا اپنے تعلق والوں) میں کرنا چاہئے، اور خطاب عام میں ایک تو ایسے لوگ ہوں جو مسلمانوں کے لئے مناسب وعظ کیا کریں تا کہ ان کی اصلاح ہو اور ایک وہ ہوں جو ایسے لوگوں کے مقابلہ میں تبلیغ کریں جن کو اسلام پر کچھ شبہ ہو گیا ہو، یا اسلام سے تعلق کم ہو گیا ہو (جیسے انگریزی خواں مسلمان) یا سرے سے غیر مسلم ہوں۔
>
> اور ایک آخری جماعت ایسی ہو جو ان عام تبلیغ والوں کی بشری ضرورتوں کا سامان مہیا کرے تا کہ وہ اپنے فرض منصبی میں بے فکری سے مشغول ہو سکیں۔
>
> نیز ارشاد فرماتے ہیں:۔
>
> تبلیغ یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر صرف علماء ہی کا کام نہیں، البتہ اس کی دو قسمیں ہیں، ایک خطاب عام دوسرے خطاب خاص۔

دوسری تقسیم یہ ہے ایک خطاب منصوصات وقطعیات میں ہوتا ہے، اور ایک اجتہادیات میں، پس خطاب عام بصورت وعظ اوراسی طرح امور اجتہادیہ میں خطاب یہ تو علماء ہی کا کام ہے، مگر انفرادی طور پر ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو نصیحت کر سکتا ہے، اسی طرح جو مسائل منصوص اور قطعی ہیں ان میں ہر شخص باآواز بلند کہہ سکتا ہے کہ مثلاً ایمان لانا فرض ہے، نماز روزہ، حج، زکوۃ فرض ہے۔ (تجدید تعلیم وتبلیغ، ص:۲۳۱)

حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ کی ایک فکر

حضرت مولانا عبدالباری ندوی تحریر فرماتے ہیں:۔

(پہلے) یونانی فلسفیات سے پیدا ہونے والے شکوک وشبہات زیادہ تر عقائد کے دقیق مسائل تک محدود تھے، سیاسیات ومعاشیات، تہذیب وتمدن جن کا اثر عوام وخواص کے سارے طبقات پر پڑتا ہے، ان کے بھیس میں لادینی نظریات وتصورات کی دعوت واشاعت نہ ہوتی تھی، آج ذہن پہلے انہی راستوں سے مسموم ہوتا اور بالآخر غیر شعوری طور پر ایمان وعمل سب کو لے ڈوبتا ہے۔

یونانیات کے مقابلہ میں اگر ہمارے علماء ومتکلمین کو کل صرف ایمانیات کے ایک محاذ کا سامنا تھا تو آج انفرادی واجتماعی سیاسی ومعاشی تمدنی وثقافتی غرض زندگی کے ہر ہر محاذ پر مسلح ہونے اور رہنے کی ضرورت ہے۔

اس ضرورت کا احساس پہلے پہل اکابر ندوہ نے فرمایا اور ایک مستقل درسگاہ (دارالعلوم) کا قیام زیادہ تر اسی غرض سے عمل میں آیا۔

ندوہ اور جو ادارہ بھی اس فرض کفایہ کا حق کماحقہ ادا کرنے کی طرف متوجہ ہو، دو باتوں کا انتظام ازبس ضروری ہے۔

اول واقدم تعلیم کے ساتھ ایسی دینی تربیت کا اہتمام کہ ایمان وعملی صورت وسیرت ظاہر وباطن ہر اعتبار سے اس خدمت کے خدام اسلام کی نمائندگی یا ''شہادت علی الناس'' کا جاذب ومعیاری نمونہ ہو، عمل میں خالق کے

ساتھ مخلوق کے حقوق یا اسلامی معاملات ومعاشرات کی نگہداشت اسلام کو سب سے زیادہ پرکشش بتاتی ہے۔

سیرت کے ساتھ وضع وصورت کا معاملہ بھی حقیر وخفیف ہرگز نہیں، خاص کر اس جماعت کے لئے جو غیروں یا مخالفوں کے دل ودماغ سے اسلام کے متعلق ایمانی وعملی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو نکالنے کا فرض پورا کرنا چاہتی ہے، اپنے پرائے سب کا سابقہ عقائد وعبادات سے پہلے معاملات ومعاشرت ہی سے پڑتا ہے، اور سب کی نظر باطن وسیرت سے پہلے ظاہر وصورت کو دیکھتی ہے، آدمی سن کر کم اور دیکھ کر زیادہ قبول کرتا ہے۔

دوسرا کام جدید چیزوں کی مستند ومنضبط تعلیم ہے، جامعہ عثمانیہ کی بدولت جدید علوم وفنون کی ضرورت ومعتبر کتابیں خود اردو میں منتقل ہوگئی ہیں، ان میں سے پیش نظر مقصد کے مناسب چیزوں کو قدیم معقولات کی جگہ باقاعدہ نصاب میں شریک کردینا کافی ہوگا"۔ (تجدید تعلیم وتبلیغ ص ۲۸۷)

اطلاع

حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی اصلاحات وتجدیدات کو سامنے رکھ کر مختلف موضوعات پر متعدد مجموعے مرتب کیے، مثلاً تجدید تعلیم وتبلیغ، تجدید تصوف وسلوک، تجدید معاشیات وغیرہ، منجملہ ان کے سیاست وحکومت کا موضوع بھی مولانا کے پیش نظر تھا، چنانچہ اس موضوع سے متعلق مولانا نے کافی مواد جمع کیا اور مرتب انداز میں "معارف" میں کئی قسطوں میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی زیر نگرانی شائع ہوتا رہا، لیکن مستقل رسالہ کی شکل میں علاحدہ اس کی اشاعت نہیں ہوسکی، اور لوگوں کے پیش نظر بھی نہیں، ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مولانا عبدالباری ندویؒ کی ان کاوشوں کی قدر کرتے ہوئے ان کے دیگر مجموعوں کی طرح اس کی بھی مستقلاً اشاعت کی جائے، اپنے موضوع کی وہ اہم چیز ہوگی، انشاءاللہ تعالی۔

مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب
مذہب وسائنس- ایک مطالعہ

از: فیصل احمد ندوی بھٹکلی (۱)

ندوۃ العلماء کی تحریک زمانے کا تقاضا اور وقت کی آواز تھی، اور اس کا دارالعلوم موسسین کے غیرت مند نفوس کی تڑپ، ان کے بیدار دلوں کی دھڑکن، ان کے جذبات کا عکس جمیل اور ان کے خواب نوشین کی تعبیر اوّلین تھا، ابتداء ہی میں یہ درخت ایسا پھلا پھولا اور ایسے برگ وبار لایا کہ دنیا کی نظریں اس کی طرف اٹھنے لگیں اور داد وتحسین کی صدا ہر سو بلند ہونے لگی، مولانا عبدالباری ندوی اس سدا بہار شجر ثمر آور کے نہایت تروتازہ پھل اور اس چمنستانِ علم وادب کے ایک گل نسترن تھے۔

حضرت مولانا عبدالباری ندوی صاحب نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں وہ انیسویں صدی کے اواخر کا زمانہ تھا، جب مادیت نے اپنے سائنسی رجحانات، اکتشافات و ایجادات کے بل پر عالمگیر وبا کی صورت اختیار کی تھی، اور علوم فلکیات، طبعیات اور حیاتیات کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے مادیت کے پیٹ سے نکلی دہریت کو زبردست تقویت پہنچی تھی، اور ظاہر بیں لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کیا تھا کہ سائنس نے مذہب کی جڑیں کھوکھلی کردی ہیں۔

کلیسا اور سائنس کا تصادم ایک مشہور بات ہے، لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اولاً کلیسا منطق سائنس اور فلسفے کے سایے میں عیسوی اعتقادات اور مذہبی تعلیمات کی عقلی اور

---

(۱) استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء۔

سائنسی توجیہات پیش کر رہا تھا، مگر غیر ضروری بحثوں میں الجھنے اور غیر متعلق دائروں میں قدم رکھنے کی وجہ سے اس کا قدم پھسلنے لگا اور اس کو اپنا وجود باقی رکھنا مشکل ہو گیا، بالآخر شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے اپنے بقا کی خاطر سائنس سے فرار اور انکار کی راہ اختیار کی، مگر سائنس میں جو طاقت تھی کلیسا میں نہ تھی، ردعمل میں سائنس نے کلیسا کے خلاف بغاوت کی اور اس زور سے کلیسا کی بنیادوں پر حملہ کر دیا کہ اس کی چولیں ہل گئیں اور اس کی رہی سہی ساکھ مٹ کر رہ گئی، اور اس کو سائنس کے مقابلے میں شکست تسلیم کرنی پڑی، مگر اس نے ظاہر میں دنیا کو دھوکا دینے کے لیے کہ اس کا وجود ابھی باقی ہے سائنس کے ساتھ مصالحت کا رویہ اپنایا، ایسی مصالحت جس کی کوشش شکست خوردہ، ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد، اپنے تمام افکار و نظریات اور مطالبات سے دستبردار ہو کر صرف اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے کرتا ہے اور فاتح اپنی مصلحت کی خاطر - کہ وقت ضرورت اس سے کام لے اور اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے - اس کے وجود کی ضمانت لکھ دیتا ہے۔

یہ سب سے بڑی دلیل تھی کہ کلیسا میں کوئی روح اور طاقت نہیں تھی، وہ اپنے دھونس کے بل پر چل رہا تھا، یہ کلیسا کی بدقسمتی تھی کہ غیر ضروری دائروں میں قدم رکھنے اور غیر متعلق علوم میں مداخلت کی وجہ سے اسے ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا، اگر وہ واقعی مذہب کا ہم نوا تھا اور مخصوص عقائد سے قطع نظر نفس مذہب سے اس کا تعلق تھا، تو اس کو اسلام کے دائرے میں پناہ ملتی اور اربابِ کلیسا اسلام کے علمبردار ہو کر سائنس کو مذہب کے قدم بہ قدم آگے بڑھنے کا موقع دیتے اور اخلاقی انارکی اور مادہ پرستی کے خوفناک وہ مظاہر جن کی وجہ سے دنیا جہنم بنی ہوئی ہے، سامنے نہ آتے۔

اس کے بالمقابل اسلام نے اول دن ہی سے فلسفہ و سائنس کے ساتھ دوسرا رویہ رکھا۔ یہ اسلام کی ابدیت کی دلیل اس کی کامیابی کا راز اور علمائے اسلام کی توفیق کی بات تھی کہ انھوں نے فلسفہ و سائنس کو اپنانے یا رد کرنے سے پہلے گہرائی کے ساتھ اس کا تنقیدی مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام اور سائنس میں کوئی تصادم یا ٹکراؤ ہے ہی نہیں، نہ ہو

سکتا ہے، سائنس کا راستہ الگ اور مذہب کا راستہ الگ ہے۔

سائنس چند نظریات اور مفروضات کا نام ہے۔ قیاس، گمان، مفروضات اور اندازوں کے ذریعے سائنس کا سفر آگے بڑھتا ہے، سائنس کبھی قطعی، حتمی اور یقینی علم مہیا نہیں کرتی۔ نوبل انعام یافتہ سائنس داں فائن مین (R.P Feynman) جیسے بڑے بڑے سائنس داں اس کا صاف اعتراف کر چکے ہیں، بلکہ کوئی بھی سائنس داں سائنسی نتائج کو حتمی اور قطعی تسلیم نہیں کرتا، اس لیے کہ اس کے نظریات آئے دن بدلتے رہتے ہیں، سالہا سال تسلیم شدہ حقیقت کسی جدید اس کے مخالف نظریے سے لچر قرار پاتی ہے، جب کہ اسلام چند ثابت شدہ حقائق کا نام ہے، جن میں کبھی تبدیلی نہیں آ سکتی۔

چناں چہ دراصل عیسائیت میں جنگ مذہب اور سائنس کے مابین نہیں تھی، جنگ اصلاً قدیم سائنس اور جدید سائنس کی تھی جو علوم عقلیہ میں کلیسا کی غلط طریقے سے شمولیت، جلد بازی، عاقبت نا اندیشی اور عقلی علوم سے مرعوبیت کے باعث مذہب و سائنس کی جنگ میں تبدیل ہوگئی، اس امت پر اللہ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے حجۃ الاسلام امام غزالی اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ جیسے مجددین کو پیدا کیا، ان کے تجدیدی کارناموں میں یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی علمیت میں سائنس و فلسفہ کے قضایا کے داخل ہونے کا راستہ قیامت تک بند کر دیا (تفصیل کے لیے دیکھیے محمد ظفر اقبال کی کتاب اسلام اور جدید سائنس: نئے تناظر میں، نوادرات، ساہیوال، پنجاب پاکستان)

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نہ صرف یہ کہ کبھی سائنس کی غلامی اختیار نہیں کی اور اس کے سامنے شکست قبول نہیں کی، بلکہ آگے بڑھ کر اس پر وار کیا، اور اس کا بودا پن اور کھوکھلا پن ثابت کر کے اسلام کے سامنے اسے جھکنے پر مجبور کر دیا۔

اپنے اپنے زمانے میں امام غزالی اور امام ابن تیمیہ نے اس سلسلے میں جو کارنامے انجام دیے تھے، یہی تجدیدی کارنامہ ندوے کے بلکہ برصغیر کے قابل فخر سپوت حضرت مولانا عبدالباری ندوی نے انجام دیا۔

مولانا کی کتاب ''مذہب وعقلیات'' (اور اسی کا امتداد یہ کتاب مذہب وسائنس ہے) کو پڑھ کر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمایا تھا کہ یہ ''مذہب کا آہنی قلعہ ہے'' مولانا تھانوی کے الفاظ جو تول تول کر بولتے تھے اور بقدر ضرورت الفاظ استعمال کرتے تھے، اپنے اندر بہت معنویت رکھتے ہیں۔ اور مولانا شروانی کے الفاظ میں فلسفے نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا ہے۔

مولانا نے اپنی اس کتاب ''مذہب وسائنس'' میں سائنس دانوں کے بدلتے ہوئے نظریات اور آئے دن ایک نظریے کے غلط ثابت ہو کر اس کی جگہ دوسرے نظریے کے ظاہر ہونے کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان نظریات کی کوئی حقیقت نہیں، تو ایک ابدی ازلی اور اٹل حقیقت کو کیوں نہ مانا جائے۔

خلاصے کے طور پر ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

> لیجیے عقل وفلسفہ کی دنیا میں علت ومعلول کا جو قانون ازلی اور ابدی حیثیت سے مسلّم چلا آرہا تھا، بیسویں صدی نے اس کا بھی بخیہ ادھیڑ دیا اور اگر علت ومعلول یا قانونِ علیت کا جبر کسی ذرہ میں بھی کارفرما نہیں تو پھر ایک اختیار وارادہ والی ذات کے اختیار ومشیت کے سوا کوئی دوسرا قابل قبول ومعقول احتمال سچ پوچھیے تو رہ ہی کیا جاتا ہے!۔

سائنس نے خود اعتراف کیا ہے کہ وہ مذہب کے باب میں رائے زنی نہیں کرسکتی۔ مولانا نے سائنس دانوں کا اعتراف ان الفاظ میں نقل کیا ہے:۔

> غرض سائنس کی انتہا بھی صرف اتنا ہی بتلانا ہے کہ چیزیں عمل کیسے کرتی ہیں، نہ یہ کہ وہ بذات خود اپنی حقیقت میں ہیں کیا؟ لازماً غریب سائنس مذہب کے باب میں کیا رائے زنی کرسکتی ہے۔ (ص:۱۷۷)

کتاب کے مقدمہ نگار ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی لکھتے ہیں:۔

> بہر حال جب مادیت اور دہریت کے پرستاروں کا وہ طلسم جو انھوں نے

سائنس کی بنیادوں پر قائم کیا تھا، ٹوٹ گیا، تو پھر کائنات کی حقیقت پر غور کرنے والوں کے لیے بمصداق ''کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو'' خدا کی ہستی پر ایمان لانے کے لیے نئی راہیں کھل گئیں اور کم از کم ایک ہمہ گیر آفاقی ذہن (Universal Mind) کو تسلیم کرنا ناگزیر ہو گیا۔ حضرت مولانا عبدالباری ندوی نے اس حقیقت کو اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور ان اصحاب کے لیے جو سائنس اور ٹکنالوجی کی حالیہ غیر معمولی ترقی سے مرعوب اور متاثر ہو کر ایمان کی کمزوری کا شکار ہو رہے ہیں یقین محکم حاصل کرنے اور دنیا و آخرت میں نجات پانے کے لیے سامان مہیا کیا ہے۔

سیمینار کی رپورٹ

محمد وثیق ندوی - محمد سلمان نسیم ندوی

دار العلوم ندوۃ العلماء کے نامور فرزند، علامہ شبلیؒ کے تربیت یافتہ، مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ ومجاز، فلسفہ وسائنس کے غزالی وابن تیمیہ اور تصوف وتزکیہ کے رمز شناس مولانا عبدالباری ندویؒ کی شخصیت اوران کی دینی وعلمی خدمات کے موضوع پر ایک روزہ سیمینار دار العلوم ندوۃ العلماء کے عباسیہ ہال میں بتاریخ ۲۲/نومبر ۲۱۰۵ء منعقد ہوا جس میں ملک کی متعدد علمی دانشگاہوں سے اہل علم ودانش کی ایک معتد بہ تعداد شریک ہوئی، خاص طور پر علی گڈھ، اعظم گڈھ، بھوپال، حیدرآباد، بنگلور، اورنگ آباد، مالیگاؤں اور شہر لکھنو کے اہل علم وذوق شریک ہوئے۔ سیمینار کا اہتمام ندوۃ العلماء اور مولانا عبدالباری ندوی ایجوکیشنل سوسائٹی لکھنو کے مشترکہ تعاون سے کیا گیا، سیمینار کا آغاز قاری ریاض احمد مظاہری کی تلاوت سے ہوا اور تین نشستیں ہوئیں۔

سیمینار کی افتتاحی نشست میر کارواں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کی صدارت میں منعقد ہوئی، مولانا نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا:۔

> مولانا عبدالباری ندویؒ کی علمی واصلاحی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، انہوں نے جہاں ایک طرف فلسفہ کو اپنا میدان بنایا، وہیں دوسری طرف تصوف وسلوک کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے، جس کا منہ بولتا ثبوت ان کی کتابیں ہیں، انہوں نے مذہب وسائنس کو نئے نقطۂ نظر سے دیکھا اور دونوں کے ٹکراؤ کو مفروضہ قرار دیا، جوان کی علمی بلند ہمتی کی دلیل ہے، مولانا عبدالباریؒ کی شخصیت ہمہ جہت تھی، انہوں نے اپنی علمی پختگی اور عزم مصمم سے فلسفہ کی سنگلاخ وادیوں کی نہ صرف سیر کی؛ بلکہ مذہب وفلسفہ کو ایک دوسرے سے قریب کیا، اسی

طرح مولانا عبد الباری ندویؒ نے تصوف وسلوک کے میدان میں کام کرتے ہوئے ''تجدید دین کامل'' جیسی کتاب تحریر کی، مولانا کی شخصیت کی گوناگوں صفات وخصوصیات ہماری نگاہوں سے مستور ہیں جبکہ مولانا نے مختلف جہتوں سے تجدیدی کارنامہ انجام دیا ہے، مولانا کی تجدیدی خدمات کا دائرہ فلسفہ وسائنس سے لے کر تصوف وتزکیہ تک پھیلا ہوا ہے، ان کی شخصیت علامہ شبلی کی تربیت اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی توجہ کی بنا پر وسیع تر تھی، مولانا کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے علم کو صحیح رُخ دیا اور اس کو صحیح راہ پر لگایا، موجودہ دور میں جبکہ ابلاغ وترسیل کے ذرائع ووسائل کی کثرت وتنوع کی وجہ سے علم میں انتشار اور الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے ان کے اس وصف کی اہمیت ومعنویت اور بڑھ جاتی ہے، آج بھی علم کو صحیح رخ دینے کی ضرورت ہے جس میں یہ سیمینار معاون ثابت ہوگا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے اپنی افتتاحی تقریر میں حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

مولانا عبد الباری ندویؒ کا بنیادی کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے علوم عقلیہ اور اسلامی تمدن کے درمیان ایک پل تعمیر کیا اور اپنی تصنیفات کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ اسلامی تمدن اور علوم عقلیہ کو کس طرح جامعیت کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے، اسی جامعیت کی تلاش اور اس پر عمل اس سیمینار کا مقصد ہے۔

مولانا سید سلمان حسینی ندوی نے اپنے مقالہ ''مولانا عبد الباری ندویؒ کی تصنیف مذہب وسائنس'' کی تلخیص پیش کرتے ہوئے کہا کہ:۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک عربی رسالہ ''المقتطف'' آتا تھا جس میں سائنس کے مضامین ہوتے تھے، مولانا اس کو پورا پڑھتے تھے، یہیں سے ان کو فلسفہ سے دلچسپی پیدا ہوئی، مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریابادیؒ ان کے رفیق وہمدم تھے جو خود فلسفہ سے دلچسپی رکھتے تھے اور انگریزی کے ماہر ادیب بھی تھے اس طرح مولانا کو انگریزی کا شوق ہوا، علامہ شبلی نے ان کے اس جوہر کو پہچان لیا اور ان کے اس ذوق کی آبیاری میں پورا حصہ لیا، پھر حضرت تھانویؒ کی مردم

شناس نگاہ نے ان کو خلافت واجازت سے سرفراز کیا، اس طرح مولانا کی شخصیت کی تعمیر ہوئی اور مولانا کے قلم نے فلسفہ وسائنس کو اپنی علمی جولانگاہ کا مرکز ومحور بنایا، اس موضوع پر ان کی تحریروں کو جہاں حضرت تھانوی نے اسلام کا آہنی قلعہ قرار دیا تو وہیں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے بقول فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، مولانا کی تحریر دراصل فلسفہ وسائنس کو ایک چیلنج تھا جو ندوۃ العلماء کی صف سے دیا گیا تھا، مولانا کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے فلسفہ وسائنس کا جواب دین ومذہب کی روشنی میں دینے کے بجائے خود اس موضوع کے ماہرین کی تحریروں سے اس کے کل پرزے بکھیر دیے، مولانا کی کتاب ''مذہب وسائنس'' دراصل فلسفہ وسائنس کی خودکشی کا اعلامیہ تھا۔

سیمینار کے شرکاء کا استقبال کرتے ہوئے اس کے کنوینر مولانا نذرالحفیظ ندوی نے کہا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمایا تھا کہ:۔

اخلاص اور اختصاص سے ہر قفل کو کھولا جا سکتا ہے، اخلاص واختصاص ہی مولانا عبدالباری ندویؒ کی زندگی کا اصل جوہر ہیں، مولانا علی میاں ندویؒ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مخلص کی کشتی بھنور سے نکل آتی ہے جبکہ غیر مخلص کی کشتی ساحل پر ڈوب جاتی ہے، آج ایک طویل عرصہ کے بعد مولانا عبدالباری ندوی پر یہ سیمینار اور ان کی خدمات کا تذکرہ ان کے اخلاص کی دلیل ہے۔

افتتاحی نشست کے بعد مقالات کی پہلی نشست پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں اہل علم ودانش نے مولانا عبدالباری ندویؒ کی شخصیت اور علمی ودینی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر اپنے بیش قیمت مقالے پیش کیے، نظامت کے فرائض مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی نے انجام دئے، ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے 'مولانا عبد الباری ایک مایہ ناز شخصیت اور عظیم فلسفی'' کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا عبدالباری ندوی نے اپنے فلسفیانہ اور عقلیاتی مباحث سے ثابت کیا ہے کہ اسلام زندگی کی ضرورت ہے، جس کے بغیر کام نہیں چل سکتا ہے، یہ دین یونانی اصول وضوابط کی طرح نہیں جو

فرسودہ ہو جائے، انہوں نے کہا کہ مولانا سید سلیمان ندوی مولانا عبدالباری کو اپنے دور کے اکابر علماء میں شمار کرتے تھے۔

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی نے "مولانا عبدالباری ندوی اور مذہب وعقلیات کے ٹکراؤ کا تصور" کے عنوان پر اپنے مقالہ میں کہا کہ مولانا عبدالباری ندوی نے فلسفہ قدیم وجدید کا گہرا مطالعہ کیا تھا، انہوں نے کہا کہ مولانا عبدالباری ندوی کو دور جدید کا امام غزالی کہا جاتا ہے کیوں کہ انہوں مذہب وعقلیات کا اس طرح مطالعہ کیا کہ دونوں کے ٹکراؤ کے تصور کو مسترد کر دیا، یہ مقالہ مولانا محمد خالد گونڈوی ندوی نے پیش کیا۔

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی (تفسیر سورۃ العصر المسمی بہ نظام صلاح واصلاح تنقیدی جائزہ) مولانا خالد غازیپوری ندوی (فلسفہ جدید کا نکتہ داں عبقری شخصیت مولانا عبد الباری ندوی) مولانا مفتی محمد زید مظاہری ندوی (مولانا عبدالباری ندوی: ان کا سلسلہ تجدید اور اس کی خصوصیات) پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی (مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی اور مولانا عبدالباری کے باہمی مراسم) اور پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی (مولانا عبدالباری ندوی کی اہم تصنیف "تجدید معاشیات" ایک تعارفی مطالعہ) نے اپنے مقالات پیش کیے۔

تیسری نشست بعد نماز مغرب جناب پروفیسر احتشام احمد صاحب ندوی کی صدارت میں منعقد ہوئی اور نظامت مولانا عمیر الصدیق صاحب ندوی نے کی اور "مولانا عبدالباری ندوی اور دارالمصنفین" کے موضوع پر مقالہ بھی پیش کیا، پروفیسر محسن عثمانی ندوی (مذہب وسائنس) مولانا علاء الدین صاحب ندوی (مولانا عبدالباری ندوی کا ذوق تصوف تجدید تصوف وسلوک کے آئینہ میں) ڈاکٹر محمد راشد نسیم ندوی (معجزات انبیاء اور مولانا عبدالباری ندوی کی اس پر تحقیقات)، مولانا محمود حسن ندوی (مولانا عبدالباری ندوی اور اسلامی اقامت خانوں کی دعوت اور اس کے اثرات) مولانا فیصل احمد ندوی (مولانا عبدالباری کی تصنیف "مذہب وسائنس) ڈاکٹر سفیان حسان خاں ندوی (مولانا عبدالباریؒ کے خطوط مولانا عمران خان ندویؒ کے نام) مولانا برہان الدین سنبھلی (مولانا عبدالباری ندوی اور ان کا سلسلۂ تجدید) اور مولانا محمد مسعود

عزیزی ندوی (حضرت مولانا عبدالباری ندوی ایک عارف اور ولی) نے اپنے مقالات پیش کیے اوراخیر میں پروفیسر احتشام احمد ندوی نے ''مولانا عبدالباری ندوی کی عظمت کے چند پہلو'' کے موضوع مقالہ پیش کیا۔

اس نشست میں ترکی کے ایک موقر وفد نے شرکت کی اور مولانا سید سلمان حسینی ندوی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ندوہ کا تعارف کرایا اور مہانوں نے اپنے تاثرات پیش کیے، مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی ناظر عام ندوۃ العلماء اور مولانا عبدالباری ندوی ایجوکیشنل سوسائٹی کے سکریٹری حاجی فضل الباری نے علماء، مندوبین، منتظمین اور طلبہ کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار کا اختتام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کی دعا پر ہوا۔

افتتاحی نشست کے اختتام پر کئی کتابوں کا اجراء عمل میں آیا، جن میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی ''حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی خدمات'' معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی تازہ تصنیف ''موجودہ تہذیب وتمدن اور عالم اسلام'' اور مولانا محمود حسن حسنی ندوی کی کتاب ''حیات عبدالباری'' کا عربی ایڈیشن ''الشيخ عبدالباري الندوي: حياته وآثاره'' شامل ہیں۔ آخر الذکر کتاب کا عربی ترجمہ عطاءالرحمٰن حفظ الرحمٰن ندوی نے کیا ہے۔ ''حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی خدمات'' کو مولانا محمود حسن حسنی ندوی کی ترتیب جدید کے ساتھ پہلی مرتبہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام نے شائع کیا ہے۔

سیمینار کے انعقاد کو منظم طریقہ سے انجام دینے کے لیے جناب مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی نے ناظر عام ندوۃ العلماء جناب مولانا محمد حمزہ حسنی صاحب ندوی کے مشورہ سے درج ذیل اساتذۂ دار العلوم ندوۃ العلماء پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل دی:۔

۱۔ جناب مولانا رشید احمد صاحب ندوی۔

۲۔ جناب مولانا فخر الدین طیب صاحب ندوی۔

۳۔ جناب مولانا محمد خالد گونڈوی صاحب ندوی۔

۴۔ جناب مولانا ساجد علی صاحب ندوی

۵۔ جناب مولانا محمد وثیق صاحب ندوی

۶۔ جناب مولانا عبدالرحیم صاحب ندوی۔

۷۔ جناب مولانا سلمان نسیم صاحب ندوی۔

سیمینار کی مناسبت سے ''مولانا عبدالباری ندوی: حیات اور علمی ودینی خدمات'' کے موضوع پر مرکزی جمعیۃ الاصلاح دار العلوم ندوۃ العلماء کے زیر انتظام آل ندوہ انعامی مسابقہ کرایا گیا، جس میں دار العلوم ندوۃ العلماء اور ملحقہ مدارس کے ۴۲ رطلبہ نے حصہ لیا اور ۱۵ سے ۲۰ رصفحات پر مشتمل مقالات پیش کیے، مسابقہ ۱۰۰ ارنمبر کا ہوا، ۵۰ رنمبر مقالہ نویسی اور ۵۰ ر نمبر عرض مقالہ کے رکھے گئے، پہلے مرحلہ میں ممتحن حضرات نے مقالات چیک کیے اور پھر دوسرے مرحلہ میں ہر مساہم نے ۶ منٹ میں مقالہ کی تلخیص پیش کی۔ اس مسابقہ میں اول انعام: پانچ ہزار، دوم انعام: تین ہزار، سوم انعام: دو ہزار، اور اس کے علاوہ پانچ تشجیعی انعامات مبلغ ایک ایک ہزار کے رکھے گئے۔

مذہب اور عقلیات
حضرت مولانا عبد الباری ندوی
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ